معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNBEIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ـــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۸　ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۱ء　عدد ۵

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

وفیات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

۲۶، ۲۷ اکتوبر کو دارالمصنفین کی مجلس عاملہ و انتظامیہ کے جلسے ہوئے، ان میں شرکت کیلئے مجلس عاملہ کے صدر محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اپنی علالت و معذوری کے باوجود مشقت برداشت کر کے تشریف لائے، جن کے اخلاص وللّٰہیت کی برکت دارالمصنفین پر چھائی رہی، ان کے ساتھ ہی مولانا سید محمد رابع ندوی کی تشریف آوری بھی موجب خیر و برکت تھی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اپنی خندہ روئی، نرمی اور شرافت سے ہر شخص کا مرکز توجہ بنے ہوئے تھے، مولانا محمد سعید مجددی بھوپال سے تعب و تکلیف جھیلتے ہوئے آئے اور اپنے علم و عرفان کا نقش چھوڑ گئے، ڈاکٹر محمد معظم جیراج پوری کی نقل و حرکت سے معذوری دارالمصنفین کی محبت میں حائل نہیں ہوئی، اور وہ دونوں جلسوں میں شریک ہوئے، جناب سید شہاب الدین دسنوی بھی عوارض میں مبتلا تھے لیکن وہ دارالمصنفین کے کاموں میں نوجوانوں سے زیادہ چاق وچوبند رہتے ہیں، غرض تین چار روز تک دارالمصنفین میں بڑی چہل پہل اور ع اے آمدنت باعث آبادی ما ' کا سماں رہا۔

دارالمصنفین کے فاضل ارکان نے اس کے علمی و انتظامی شعبوں کی کارگذاری اور حسابات کا جائزہ لے کر الحمدللہ اطمینان ظاہر کیا، لیکن اسے وسعت و ترقی دینے اور مزید فعال و موثر بنانے کے لیے اس کی آمدنی کے وسائل و ذرائع بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی، کتب خانہ میں اضافہ و توسیع اور مطبع کی طباعت کو بہتر بنانے کے مسائل خاص طور پر زیر بحث آئے دارالمصنفین کی جو کتابیں عرصہ سے طبع نہیں ہو رہی ہیں ان کے عکسی ایڈیشن جلد از جلد شائع کیے جانے پر زور دیا گیا، کتب خانہ میں گو بلند پایہ کتابوں کا اچھا ذخیرہ پہلے سے موجود ہے تاہم اسے "اپ ٹو ڈیٹ" بنانے کے لیے طے پایا کہ قدماء کی نایاب کتابوں اور قدیم مطبوعہ کتابوں کے محقق و محشی نئے اڈیشن اور زمانۂ حال کے فضلاء کی تصنیفات بقیمت یا بلا قیمت

حاصل کی جائیں، اور اس کے لیے عرب ملکوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔

دارالمصنفین نے عام روش کی پیروی اور شہرت و نام و نمود کے سطحی طریقے اختیار کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، آج کل جس کثرت سے سمینار ہو رہے ہیں اتنا ہی ان کا معیار پست ہوتا جارہا ہے، اس طرح سمینار کی بنیادی غرض و غایت ختم ہوتی جارہی ہے، لیکن دارالمصنفین کو اس کے مفید اثرات و نتائج سے انکار نہیں ہے، اسی لیے اس کے معزز ارکان نے بھی وقتاً فوقتاً دارالمصنفین کے شایان شان باوقار سمینار کرنے کا فیصلہ کیا ہے سمینار کو صحیح رخ دینے اور اسے مفید، کارآمد اور بامقصد بنانے کے لیے بھی یہ قدم اٹھانا ناگزیر تھا

اردو کا رواج روز بروز کم ہوتا جارہا ہے، اس لیے بعض خیرخواہوں کا مشورہ ہے کہ دارالمصنفین میں ہندی میں تصنیف کا شعبہ قائم کیا جانا چاہیے، دمام سے ایک صاحب اس کے لیے دس ہزار روپیے کی پیشکش کی ہے، جس کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن دارالمصنفین کے محدود وسائل کی بنا پر یہ تجویز ناقابل عمل ہے، اور اس سے اس کے مقصد کے فوت ہوجانے کا اندیشہ بھی ہے، یہ ایک خالص علمی و تحقیقی ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان کی خدمت اور اس میں محققانہ کتابوں کی اشاعت ہے، ہندی میں تصنیف و ترجمہ اور کتابوں کی اشاعت کا کام مسلمانوں کے دعوتی و تبلیغی اداروں کو کرنا چاہیے، جو اسی مقصد کے لیے قائم کیے گئے ہیں، ہندی کے فروغ کے لیے ملک میں متعدد ادارے موجود ہیں، جن کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور جن کے پاس وسائل کی بھی کمی نہیں ہے، وہ فراخ دلی سے کام لے کر اردو کی کچھ خدمت اپنے ذمہ لے سکتے ہیں یا کم از کم اردو کتابوں کو ہندی میں منتقل کر سکتے ہیں، اس موقع پر ہم کو بے اختیار ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد یاد آگئی، جو اردو سے کنارہ کش ہوکر اب خالص ہندی اکیڈمی ہوگئی ہے اور ۱۹۸۲ء کے بعد سے اس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا ہے۔

ہندی سے مسلمانوں کو کبھی بیر نہیں رہا، مسلم حکمرانوں کے دور میں ہندی اور برج بھاشا کے متعدد مسلمان فضلاء اور اہل کمال پیدا ہوئے، اس زمانہ میں بھی ہندی سے ان کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے، لیکن اب ملک کی نئی نسلیں اور خود مسلمان بھی اردو سے ناواقف ہوتے جارہے ہیں، جس کی وجہ سے اردو کے ادارے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے ہیں، حالانکہ اردو اس ملک کی مشترک تہذیب اور اس کے فخر و عظمت کی نشانی ہے، اس کی خدمت خود ملک کی خدمت ہے، اس کے بغیر ملک کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہے گا، ہندی کے تسلط کی وجہ سے اردو ہی سے دستبردار ہونا اپنی تہذیب اور اپنے ملک کی عظمت سے دستبردار ہونا ہے، کیا ہندی کے فروغ کے لیے اردو کشی ضروری ہے، اور کیا اس کو ہندی کی دیوی پر قربان کردینا مناسب ہے؟ جو ادارے مخالف ہوا میں اردو کا چراغ جلائے ہوئے ہیں وہ حوصلہ افزائی اور قدردانی کے لائق ہیں ان کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اترپردیش میں اس وقت اردو دشمنی شباب کو پہونچ گئی ہے، کانگریسی حکومتیں اس کے گن گاگا کر اس کے گلے پر چھری چلاتی رہی ہیں، ملائم سنگھ کی حکومت نے اجودھیا کے تنازعہ میں ایسا الجھایا کہ اردو والے اس کا نام لینا بھول گئے، بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے ساری کسر پوری کرکے اسے جانکنی تک پہونچا دیا ہے، پتہ چلا ہے کہ محکمہ اطلاعات کا اردو ماہنامہ نیا دور کسی طرح اس کے دام سے بچ گیا، لیکن اترپردیش اردو اکادمی کی جان پر بن آئی ہے، اس کی تمام سرگرمیاں موقوف ہوگئی ہیں، اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے وظائف اور کتابت اسکولوں کے بقایا کی ادائیگی رکی ہوئی ہے، اردو مصنفین کی کتابوں پر جو انعام دیے جاتے تھے ان کو تعطل میں ڈال دیا گیا ہے، اکاڈمی کی مجالس کی نئی تشکیل کی گئی ہے لیکن اردو والوں کو اس سے دور رکھا گیا ہے ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

مقالات

خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری میں سلوک

از
ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی

حافظ شیرازی کے کلام کی خصوصیات سے واقف لوگوں پر یہ مخفی نہیں ہے کہ ان کے اکثر اشعار میں حقیقت و مجاز دونوں کی آمیزش ہے، عوام و خواص دونوں میں اس کی مقبولیت کا سبب یہی ہے۔ حافظ نے ان دونوں پہلوؤں کی رعایت کو اس طرح ملحوظ رکھا ہے کہ ان کا کلام سب کے لیے دلکش اور جاذب نظر بن گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حافظ کا سارا کلام عارفانہ ہے بلکہ انھوں نے خالص تغزل کی روایت کو بھی قائم رکھا ہے، البتہ جہاں انھوں نے حقیقت و مجاز کی آمیزش کی ہے وہ بھی اکثر تغزل کے سبب سے ہے۔ حافظ کو اپنے کلام کے اثرات کا خود بھی اندازہ تھا۔ فرماتے ہیں:۔

زشعر حافظ شیراز میخوانند و میرقصند — سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

خواجہ حافظ کے کلام کے عارفانہ پہلو کو وہی لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں جو خود صاحب معرفت ہوں وہ اپنے اشعار کے بارے میں خود کہتے ہیں:۔

من این حروف نوشتم چنانکہ غیر ندانست — تو ہم ز روی کرامت چنان بخوان کہ تو دانی

ایک جگہ کہتے ہیں :-

تا نگردی آشنا زین پردہ رمزی نشنوی گوش نامحرم نباشد جای پیغام سروش

حافظ کے اشعار پر سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی کا رقص کرنا ان کے ظاہری آب و رنگ کے سبب ہے کیونکہ ان کا رقص وجد و عرفان کے سبب نہیں ہو سکتا حافظ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ سیہ چشمان کشمیری کو ہمارے شعر میں عرفان کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ شعر کی صرف ظاہری چمک دمک پر ہی گرویدہ ہو سکتے ہیں۔

حافظ کے کلام میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جو صرف حقیقی پہلو رکھتے ہیں اور ان اشعار کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ان کے عشق حقیقی کا ارتقا ثابت کیا جا سکتا ہے اور بالکل اس کے برعکس ان کے مجازی اشعار کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ان کے عشق مجازی کے ارتقا پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ کار درست نہیں ہے کیونکہ بہت سے غیر صوفی شعرا کے کلام سے متصوفانہ اشعار کو الگ کر کے اور ان میں نظم و ترتیب قائم کر کے انہیں راہ سلوک کا سالک دکھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس مضمون میں خواجہ حافظ کی ایک ایسی غزل کا انتخاب کیا گیا ہے جو مسلسل ہے یا جسے غزل نما نظم کہہ سکتے ہیں اس میں انھوں نے اپنی اصلی شخصیت کا اظہار کیا ہے یہ غزل صرف حقیقی معنی کی حامل ہے۔ اس سے حافظ کی سیرت و شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

خواجہ حافظ نے جو اشعار حقیقت و مجاز کی آمیزش کے ساتھ لکھے ہیں انکو سمجھنے کے لیے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ صوفیہ کی وضع کردہ ان اصطلاحات اور علامات کو ملحوظ رکھا جائے جو ان کے اشعار کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ انہیں

کئی صوفیہ نے مدون کیا ہے۔ راقم الحروف کو ان میں سے کم از کم تین کا علم ہے ایک مرتبہ فخرالدین عراقی، دوسرا مرتبہ خواجہ محمد پارسا اور تیسرے مشمولہ بلفظات سید اشرف جہانگیر۔ یہ تینوں چھپ چکے ہیں جو حافظ شناسی میں نہایت معاون ہیں۔ لیکن یہاں جس غزل کا انتخاب کیا گیا ہے اس میں مشکل اصطلاحات سے گریز کیا گیا ہے اور مجازی رنگ اختیار کرنے کے بجائے حقیقت کا اظہار براہ راست کیا گیا ہے۔ اس میں حافظ نے سلوک کی منزلوں کا ذکر کیا ہے اور آخری شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام منزلوں کو طے کر کے آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ سلوک کی ان منزلوں کا ذکر اس لیے بیان کیا ہے تاکہ سالک کو سلوک کی منزلوں کا علم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان منزلوں کو طے کرنے کے بعد اسے کون سا مقام میسر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس غزل میں بھی بعض اصطلاحات صوفیہ موجود ہیں اور خصوصاً آخری شعر مجازی رنگ میں ہے لیکن غزل کا پورا آہنگ حقیقی ہے اور آخری شعر معنوی اعتبار سے بقیہ اشعار سے مربوط ہے اس لیے آخری شعر سے بھی حقیقی مراد ہی لی جا سکتی ہے۔

عام طور سے مختلف نسخوں میں اس غزل میں گیارہ اشعار ملتے ہیں۔ البتہ محمد قزوینی اور دکتر قاسم غنی نے اس غزل میں صرف آٹھ اشعار نقل کیے ہیں۔ انھوں نے تین اشعار کیوں نہیں نقل کیے اس کی وجہ نہیں معلوم۔ تاہم اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں آٹھ اشعار ہی ہیں اور بقیہ تین اشعار الحاقی ہیں تب بھی اصل مدعا کے لیے یہ آٹھ اشعار کافی ہیں۔ ان اشعار کی ترتیب مختلف نسخوں میں کچھ فرق کے ساتھ ہے بیشتر مطبوعہ نسخوں کو مقابلہ کرنے کے بعد ہمارے نزدیک اس غزل کا معتبر ترین

متن دیوان حافظ مرتبہ محمد قزوینی اور دکتر قاسم غنی ہی میں ملتا ہے جیسا کہ آیندہ بیان سے ظاہر ہوگا۔

یہاں پہلے گیارہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ چونکہ مختلف نسخوں میں اشعار کی ترتیب میں کچھ فرق ہے اس لیے ان سے اشعار مقدم و موخر کیے جا سکتے ہیں ذیل کے یہ اشعار دیوان حافظ مطبوعہ ایران پاکستان مرکز تحقیقات فارسی اسلام آباد سے لیے گئے ہیں۔

۱۔ بر سر آنم کہ گر ز دست بر آید	دست بکاری زنم کہ غصہ سر آید
۲۔ منزل دل نیست جای صحبت اغیار	دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید
۳۔ صحبت حکام ظلمت شب یلداست	نور ز خورشید خواہ، بو کہ بر آید
۴۔ بر در ارباب بی مروت دنیا	چند نشینی کہ خواجہ کی بدر آید
۵۔ بگذر زین روزگار تلخ تر از زہر	بار دگر روزگار چون شکر آید
۶۔ صالح و طالح متاع خویش نمودند	تا کہ قبول افتد و چہ در نظر آید
۷۔ بلبل عاشق تو عمر خواہ کہ آخر	باغ شود سبز و سرخ گل بدر آید
۸۔ صبر و ظفر ہر دو دوستان قدیم اند	بر اثر صبر نوبت ظفر آید
۹۔ مہتر از آن نیست در مقام توکل	صبر کنم تا کہ عمر شان بسر آید
۱۰۔ ترک گدائی مکن کہ گنج بیابی	از نظر رہروی کہ در نظر آید

۱۱۔ غفلت حافظ درین سراچہ عجب نیست

ہر کہ بمیخانہ رفت بے خبر آید

دیوان حافظ مرتبہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی میں یہ غزل اس طرح ہے۔

۱۔ بر سر آنم کہ گر ز دست بر آید	دست بکاری زنم کہ غصہ سر آید
۲۔ خلوت دل نیست جای صحبت اغیار	دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید
۳۔ صحبت حکام ظلمت شب یلداست	نور ز خورشید جوی، بو کہ بر آید
۴۔ بر در ارباب بی مروت دنیا	چند نشینی کہ خواجہ کی بدر آید
۵۔ ترک گدائی مکن کہ گنج بیابی	از نظر رہروی کہ در گذر آید
۶۔ صالح و طالح متاع خویش نمودند	تا کہ قبول افتد و کہ در نظر آید
۷۔ بلبل عاشق تو عمر خواہ کہ آخر	باغ شود سبز و شاخ گل ببر آید

۸۔ غفلت حافظ درین سراچہ عجب نیست

ہر کہ بہ میخانہ رفت بے خبر آید

دونوں متون کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی غزل میں شعر نمبر ۵، ۸، ۹ گو معنوی اعتبار سے درست ہیں۔ لیکن اگر یہ نہ بھی ہوتے تو غزل کے مطالب میں کوئی کمی نہ رہ جاتی۔ البتہ ان تین شعروں سے بعض مزید وضاحتیں ہو جاتی ہیں۔ محمد قزوینی کے مرتبہ متن میں اشعار کی ترتیب بھی زیادہ بہتر ہے لیکن ہر طرح سے جامع اسے بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لیے شعر کی ترتیب اگر قاری مفہوم کے اعتبار سے بدل دے تو یہ قابل اعتراض بات نہ ہوگی۔ ہم نے غزل پر بحث کے لیے پہلے متن کو پیش نظر رکھا ہے۔

غزل کے مطلع میں چند اشارے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حافظ کو بذات خود یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ دنیا غم و الم کی جگہ ہے اور اس میں وہی کامیاب ہے جس نے اپنے کو اس کے غموں سے آزاد کر لیا ہو۔ لیکن یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے

بلند حوصلہ اور زبردست ہمت ہونی چاہیے اور پھر اس عزم و حوصلہ کو اپنے مطلوب پر صرف کرنا چاہیے یعنی سالک کی پہلی منزل عزم و حوصلہ کے ساتھ مقصود کی طلب میں گامزن ہونا ہے۔

عزم و ہمت کے بعد دوسرا مرحلہ ہے دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنا تاکہ اس میں صرف مطلوب کی محبت کی جگہ رہے۔ دنیا کی محبت کو حافظ نے دیو کہا ہے یعنی یہ دل غیر خدا کی محبت کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں مقصود و مطلوب ظاہر ہو جاتا ہے یعنی عشق الٰہی۔

جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہو گیا تو اس کو خدا کی محبت کے قابل بنانے کے لیے کسی صاحب دل مرشد کی ضرورت ہے جس کا دل خدا کی محبت سے معمور ہو۔ اس لیے تیسرے شعر میں کہتے ہیں کہ حکام اور دنیا داروں کی صحبت دنیا کی محبت کی علامت ہے جو دل کی تاریکی کا سبب ہے۔ اسے روشن کرنے کے لیے اہل دنیا کی صحبت سے اجتناب اور کسی مرشد سے وابستگی ضروری ہے جس کو حافظ نے خورشید سے مثال دی ہے۔

لیکن اس دنیا میں آدمی ذریعہ معاش کا محتاج ہے اور حصول معاش کے لیے بسا اوقات اہل ثروت سے امیدیں وابستہ کر لیتا ہے خصوصاً وہ طبقہ جو صوفیہ کے طریقہ پر عمل نہ کرنے کے باوجود اپنے کو صوفی ظاہر کرتا ہے۔ امام غزالیؒ نے ایسے ریاکار صوفیہ کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ حافظ بھی سختی سے تاکید کرتے ہیں کہ غیر خدا سے اپنی امیدیں منقطع کر لو اور صرف خدا ہی پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید بھی رکھو۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ

يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ تاہم یہ بالکل ممکن ہے کہ اسے تنگی معاش اور افلاس و احتیاج سے گذرنا پڑے۔ حافظ کہتے ہیں کہ ان تمام شدائد اور مصائب سے خندہ پیشانی سے گذر جاؤ۔ اسکے بعد زمانہ تمہارے لیے خوشگوار ہو جائے گا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔

پانچواں شعر چوتھے شعر کی صرف مزید وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح چوتھے اور پانچویں شعر میں زہد، استغنا، ترک دنیا اور عزلت و خلوت کی تعلیم دی گئی ہے جو تقریباً ہم معنی ہیں۔

اس کے بعد دوسرے متن میں چھٹاں شعر یہ ہے جو پہلے متن میں دسویں نمبر پر ہے:۔

ترک گدائی مکن کہ گنج بیابی   از نظر رہروی کہ در گذر آید

گدائی یعنی فقر کو ترک مت کرو کہ اس راہ میں رہرو کی نظر کے طفیل تمھیں خزانہ ملے گا۔ اس شعر میں مرشد کی اطاعت مزید تاکید بھی ہے اور فقر کی تلقین بھی ہے گویا زہد و استغنا کے نتیجہ میں فقر کی دولت ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ ترتیب میں یہ شعر دوسری جگہ پر ہو۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو خزانہ راہ سلوک میں میسر ہوتا ہے وہ سالک کی نظر میں خزانہ اور دولت ہے یعنی فقر کی دولت جو عام لوگوں کی نظر میں دولت نہیں ہے۔

چھٹے شعر میں جس نکتہ کی طرف اشارہ ہے اس کا انداز متکلمانہ ہے شاید اسی وجہ سے شارحین کو اس میں اشتباہ ہوا ہے۔

چونکہ خواجہ حافظ پہلے استغنا، زہد اور عزلت نشینی کی تعلیم دے چکے ہیں اور اسی کے ساتھ دوسروں سے تمام توقعات کی نفی کر کے مرشد کی رہنمائی میں راہ سلوک تمام کرنے کی تلقین کر چکے ہیں اس لیے اب وہ کامل شریعت کی تعلیم اور جلوت کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ پہلے شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اب شریعت پر عمل کامل طور پر اور کامل اخلاص کے ساتھ ہوگا۔

زہد، عزلت اور ترک تعلقات میں آدمی کو شریعت کے بہت سے امور پر عمل کرنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ ذاتی طور پر خدا کی عبادت اور کمال اخلاص پیدا کرنے کے لیے مخلوق سے دوری ضروری تھی لیکن حقوق العباد ادا کرنے کے لیے رفتہ رفتہ دنیاوی تعلقات کے ساتھ احکام خداوندی کی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں آدمی کو جو شدائد اور دوسروں کی ایذا رسانی برداشت کرنی پڑتی ہے وہ تعلقات ہی کا نتیجہ ہے۔ اگر آدمی ساری زندگی تنہا جنگل میں جا کر گزار دے تو اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہ پیدا ہو۔ سارے مسائل تو سماجی زندگی ہی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں رہ کر اخلاق حمیدہ کی ترقی ہوتی ہے اور اس کے اظہار کا موقع ملتا ہے یعنی صبر و ضبط، رحم و مروت، صلۂ رحمی، عدل و مساوات، دوسروں کے جور و ستم اور ایذا رسانی پر تحمل وغیرہ۔ لہٰذا اب حافظ یوں کہتے ہیں۔

صالح و طالح متاع خویش نمودند تا کہ قبول افتد و کہ در نظر آید

اس شعر میں "متاع خویش نمودند" کا فاعل کارکنان قضا و قدر ہیں اور اشارہ یہ ہے کہ دنیا میں افعال نیک و بد دونوں موجود ہیں۔ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں

نیک و بد دونوں طرح کے اشخاص موجود ہیں۔ لیکن یہاں شعر میں صالح و طالح نیک و بد بندوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ طالح یعنی بد صرف انسان کی نسبت سے کہا گیا ہے کیونکہ خالق فعل صرف خدا کی ذات ہے اور برائی کو خدا کی ذات سے منسوب نہیں کر سکتے۔ انسان فعل سے صرف کسب کرتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت دقیق ہے اور اس میں بڑے مضمرات ہیں۔ یہاں اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت۔ فعل اور کسب پر تفصیلی بحث مولانا روم نے اپنی مثنوی میں کی ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ بھی مکمل نہیں ہے کہ کسب کے موضوع پر صوفیہ نے بڑی صراحت سے لکھا ہے البتہ اپنے زمانے اور ماحول کے اعتبار سے کسی نے مختصر لکھا اور کسی نے کچھ زیادہ لکھا، ان کے بحث کے طریقوں میں بھی کچھ فرق ہے۔ لیکن سب کا نقطۂ نظر ایک ہی ہے کیونکہ اس کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ صوفیہ کے یہاں کسب کی مذمت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ مطلقاً مذموم ہے۔ بعض نہایت بلند مرتبہ صوفیہ کبھی کبھی اس پر اپنے اعلیٰ مقام سے گفتگو کرتے ہیں جو صرف اپنے ہی جیسے لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے مخاطب عام لوگ نہیں ہوتے۔ اس لیے عام تعلیم یہی ہے کہ ہر ایک کو محنت اور کسب کے ذریعہ روزی حاصل کرنا چاہیے۔

خواجہ حافظ چھٹے شعر میں کہنا چاہتے ہیں کہ خالق فعل خدا کی ذات ہے آزمایش کے لیے اس نے نیک و بد دونوں طرح کے افعال پیدا کیے ہیں اور شریعت کے ذریعہ اوامر و نواہی سے آگاہ کر دیا ہے تاکہ انسان اپنے اختیار سے اس میں سے

ایک کا انتخاب کر سکے۔ اگر انسان کی نسبت سے دنیا میں خیر و شر دونوں نہ ہوتے تو شریعت کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ یہاں سالک جو مرشد کی رہبری میں راہ سلوک طے کر رہا ہے اور عشق حقیقی سے سرشار ہے اس کے لیے بد افعال کا اکتساب کرنا تو اصول کے خلاف ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ سماجی زندگی میں اس پر شریعت کے بیشتر احکامات نافذ ہوں گے اور زیادہ اسی بات کا امکان ہوتا ہے کہ اسے لوگوں سے طرح طرح کے آزار پہنچتے ہیں اور عزیمت یہ ہے کہ ہر آزار کو خوشی اور خندہ پیشانی سے قبول کرے کیونکہ جو بلا بھی اس پر نازل ہوتی ہے وہ اس کے محبوب حقیقی خدائے عز و جل کے حکم سے نازل ہوتی ہے۔ صوفیہ کی اس بات کو مرزا غالب نے اس طرح ادا کیا ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم‌کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

خود حافظ بھی صاف صاف کہتے ہیں۔

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم — کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن

مولانا روم کہتے ہیں۔

بسیار تر اخستہ روان باید شد — وانگشت نمای این و آن باید شد
گر آدمی بساز با آدمیان — ور خود ملکی بر آسمان باید شد

الغرض شریعت پر عزیمت کے ساتھ عمل کے بغیر کوئی صوفی نہیں ہو سکتا۔

خواجہ حافظ نے اس شعر میں کسب فعل کی طرف اشارہ کر کے خلق فعل اور مسئلہ تقدیر کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے۔ اس کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ اکثر لوگوں نے اس مسئلہ میں حافظ کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور بعض لوگوں نے

ان پر تضاد بیانی کا بھی الزام لگایا ہے اور یہ بھی کہ وہ جہد و عمل کے خلاف تھے جس کے ثبوت میں حافظ کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

رضا بداد، بدہ و ز جبین گرہ بگشای — کہ بر من و تو در اختیار نگشادہ ست

تقدیر ایک اسلامی عقیدہ ہے اور اس پر ہر مسلمان کا ایمان لانا ضروری ہے حافظ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں قرار دیے جا سکتے۔ اس مسئلہ پر علما، متکلمین اور صوفیہ نے کافی بحث کی ہے۔ مولانا روم اپنی مثنوی میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ ناکامی اس لیے ہوتی ہے کہ بندہ مغرور نہ ہو جائے۔ اگر آدمی اپنی تمام خواہشات کی تکمیل کر لے تو بہت سے لوگ خدا کے منکر ہو جائیں اور کامیابی اس لیے ہوتی ہے کہ بندہ مایوس نہ ہو اور اپنے عمل کو جاری رکھے یعنی کسی خواہش کی تکمیل کا یہ مقصد نہیں کہ بندہ اب عمل کرنا چھوڑ دے بلکہ اسے دوسری بلند تر خواہش کی تکمیل کے لیے اپنا عمل مسلسل زندگی بھر جاری رکھنا ہے۔ مسئلہ تقدیر کی تفہیم ابن عربی نے بھی کی ہے یہاں اسے اپنے الفاظ میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

وہ ایک مثال کے ذریعہ مسئلہ تقدیر کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ ایک قاتل گرفتار ہو کر جج کے سامنے لایا گیا۔ اس صورت میں وہ محکوم ہے اور جج حاکم جج قاتل پر اپنا حکم نافذ کرے گا لیکن جج اس حکم کے نفاذ میں حالات و شواہد کا خود بھی پابند ہے۔ گویا قاتل جو جج کا محکوم ہے اس کے حالات کا محکوم خود جج بھی ہے۔ اب یہ کہنا تو صحیح ہے کہ قاتل کی قسمت میں پھانسی تھی لیکن پھانسی کا حکم نافذ کرنے میں خود جج بھی قاتل کے حالات کا پابند تھا۔ خدا کی مثال دنیا کی عدالت کے جج سے نہیں دی جا سکتی کیونکہ خدا مالک علی الاطلاق ہے اس پر کچھ بھی

واجب نہیں ہے۔ وہ خود اپنے اوپر کچھ واجب کرلے تو یہ اس کی مرضی۔ یہ ایک طرح کا وعدہ ہے اور خدا وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ ابن عربی قرآن کی اس آیت کے تحت کہ لِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ، یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آدمی نے اپنے عمل سے اپنے لیے جو حالات پیدا کیے ہیں وہی اس کے لیے حجت ہیں اور انہیں کی بنا پر اس کے لیے حکم نافذ کیا جاتا ہے (فصوص الحکم فص عزیزیہ)

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ مسئلہ تقدیر عمل سے غافل نہیں کرتا بلکہ عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ فکری اعتبار سے اس کا تعلق توحید سے ہے اور عملی اعتبار سے اس کا تعلق نظام امن سے ہے۔ حافظ نے "رضا بداده بده ..... الخ میں جبر کی تعلیم نہیں دی ہے۔ شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو،

"اپنی تقدیر پر خندہ پیشانی سے راضی رہو کیونکہ مجھ پر اور تم پر اختیار کا دروازہ نہیں کھلا ہے۔"

دوسرے مصرعہ یعنی "کہ بر من و تو در اختیار نکشادہ ست" میں لفظ اختیار کی نفی سے بعضوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ حافظ جبر اور بے عملی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن پہلے مصرعہ کی وضاحت کے بعد جس میں آرزو اور عمل کی تعلیم اور زندہ دلی اور خوش دلی کا راز مضمر ہے دوسرے مصرعہ میں بے عملی کی تعلیم کیسے ہوسکتی ہے۔ پھر تو بیان ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور حافظ جیسے عظیم شاعر پر کم از کم بے معنی بیان کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا۔

خواجہ حافظ نے اس شعر میں خوش دلی کی تعلیم دی ہے اور دوسرے مصرعہ میں وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ عمل ضروری ہے لیکن نتیجہ کا تعین لازمی

طور پر بندہ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو بندہ اپنی ہر خواہش کی تکمیل اپنے عمل سے کر لیتا۔ وہ صرف امید رکھ سکتا ہے اور چونکہ وہ ہر خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتا اس لیے اس کے اختیار کی ایک حد ہے۔ اس کے آگے وہ مجبور ہے۔ تقدیر پر راضی رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی کے اختیار کی ایک حد ہے۔ حافظ کے دونوں مصرعوں میں فکری، بیانی اور منطقی ربط ہے اور اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حافظ نے بے عملی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے برعکس خواجہ حافظ کے دیوان میں وافر تعداد میں ایسے اشعار ہیں جن میں نصب العین کو بلند رکھنے، عالی حوصلگی اور ارفع و اعلیٰ آرزوؤں کی تعلیم دی گئی ہے۔ حافظ کا یہ شعر "رضا بداده بده ..... الخ اپنے ماقبل شعر سے مربوط ہے۔ اس لیے اس سے الگ کر کے اس شعر کو سمجھنا غلطی ہوگی، وہ شعر یہ ہے ؎

غم جہان مخور و پند من مبر از یاد   کہ این لطیفۂ نغزم ز رہروی یاد است

اوپر متاعِ خویش نمودند کا فاعل کارکنانِ قضا و قدر کو قرار دیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی شاعری میں یہ اصول رہا ہے کہ جب جملہ میں فاعل خدا کی ذات ظاہر ہو تو ایسی صورت میں فعل ہمیشہ واحد لاتے ہیں۔ لیکن جب فعل جمع ہو اور فاعل حقیقی خدا کی ذات ہو اور جملہ میں اس کا ذکر نہ ہو تو کارکنانِ قضا و قدر کو فاعل سمجھتے ہیں یعنی فاعل حقیقی اگرچہ خدا کی ذات ہے لیکن فعل جمع ہونے کے سبب ذات واحد کے بجائے وہ وجود مراد لیتے ہیں جو اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں کیونکہ خدا کی ذات کے ساتھ فعل جمع کا صیغہ لانا فارسی میں ممنوع ہے اور یہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔ قرآن میں خدا نے جب اپنے لیے متکلم کا صیغہ استعمال

کیا ہے تو کبھی واحد متکلم اور کبھی جمع متکلم دونوں استعمال کیا ہے لیکن بندوں کی طرف سے جب اپنے کو مخاطب کیا ہے تو ہمیشہ واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اس طرح قرآن خدا کے بارے میں ہمیں ایک ادب سکھاتا ہے۔

یہ شعر صالح و طالح..... الخ اس غزل کا ایک ضروری شعر ہے جس کے بغیر غزل ناقص رہ جائے گی کیونکہ اس میں عزلت کے بعد جلوت کی تعلیم دی گئی ہے اور شریعت کے ان احکام پر عزیمت کے ساتھ عمل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ جن پر عزلت کی زندگی میں عمل کرنا ممکن نہ تھا اور جس کے بغیر سیرت و شخصیت کی تکمیل پختگی کے ساتھ ممکن نہیں۔ لیکن اس شعر کی اہمیت اسی وقت ثابت ہوگی جبکہ اس کا وہی مفہوم پیش نظر ہو جو اوپر بیان کیا گیا ہے اور وہ اس وقت آسانی سے قابل قبول ہوگا۔ جب مسئلہ تقدیر اس طرح واضح ہو جائے گا جیسا کہ صوفیہ نے بیان کیا ہے اور جس کا ضروری ذکر ہم نے بھی کر دیا ہے۔

ساتواں شعر صبر و استقامت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عاشق کو ایک عمر صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے آخر میں یقیناً اس کی مقصد برآری ہوگی۔ یہ مقصد برآری کیا چیز ہے؟ حافظ نے اس کو صراحتاً نہیں بیان کیا ہے۔ صرف استعارے میں بات کی ہے کہ باغ سبز ہو جائے گا۔ اور پھول کھل اٹھیں گے یا پھولوں میں پھل آجائیں گے یعنی اسے مطلوب مل جائیگا یا وہ مقام توحید میں پہنچ جائے گا جہاں اسے تجرید و تفرید حاصل ہوگی۔ اس تجرید و تفرید کی وضاحت بہت سے صوفیہ نے کی ہے اس کے لیے منطق الطیر خواجہ فریدالدین عطار دیکھنا چاہیے۔

اس کے بعد پہلے نسخہ میں دو اشعار اور ہیں لیکن دونوں صبر کی تلقین میں ہیں اور بتاتے ہیں کہ استقامت اور صبر کے نتیجہ میں مقام توکل حاصل ہوتا ہے مقام توکل کی طرف قرآن میں یوں اشارہ ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ اس لیے یہ دونوں شعر ساتویں شعر ہی کی وضاحت کرتے ہیں۔

آخری شعر میں حافظ کہتے ہیں کہ حافظ کی غفلت اس دنیا میں کچھ تعجب خیز نہیں ہے کیونکہ میخانے میں جو گیا وہ بے خبر ہو کے آتا ہے۔ یہاں حافظ کوئی بھی استعارہ استعمال کریں شراب، میخانہ، ساقی و جام وغیرہ لیکن ظاہر ہے کہ یہ شعر غزل کے بقیہ اشعار سے مربوط ہے۔ بقیہ اشعار میں جو تعلیم دی گئی ہے اس پر عمل کرنے کا آخری نتیجہ مقطع میں ہے۔ اس لیے یہاں غفلت اور بے خبری سے مراد نشۂ شراب مجازی کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس مقام کو صوفیہ فنا فی اللہ کہتے ہیں جسے قرآن میں صبغۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر بندہ کبھی کبھی اپنی ذات سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ استغراق کی یہ کیفیت دائمی نہیں ہوتی بلکہ لمحاتی ہوتی ہے۔ حافظ نے اس لمحاتی کیفیت کی طرف ایک جگہ یوں اشارہ کیا ہے ؎

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو ۔۔۔ یعنی طمع مدار وصال دوام را

اس سے وحدت الوجود کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

غزل کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلوک میں قدم رکھنے سے پہلے حافظ کی کیا حالت تھی اور سلوک اختیار کرنے کے بعد جو حالات پیدا ہوتے رہے ان کو بیان کیا گیا ہے۔ آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غزل حافظ نے اپنے آخری دور میں لکھی جبکہ وہ فنا فی اللہ کی منزل میں

پہنچ چکے تھے۔

حافظ کی پیش نظر غزل میں جو منزلیں بیان کی گئی ہیں ہم انہیں سات منزلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اور اس سے زائد منزلوں کی بھی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس غزل میں سلوک کی مندرجہ ذیل منزلیں آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

پہلی منزل طلب اور عزم و ہمت، دوسری منزل ترک دنیا، زہد، عزلت نشینی کہ دل خدا کے عشق کی آماجگاہ بن سکے۔ تیسری منزل عشق اور عشق مرشد کی نظر و توجہ سے میسر ہوتا ہے۔ چوتھی منزل جلوت تاکہ شریعت پر بیشتر احکام کی پابندی عزیمت کے ساتھ ہو سکے اور حقوق العباد کو بطور احسن ادا کیا جا سکے۔ پانچویں منزل صبر و استقامت اور لوگوں کے ظلم و جور اور طعن و طنز وغیرہ پر تحمل تاکہ مقام توکل کا بلند ترین درجہ حاصل ہو سکے اور بندہ فَهُوَ حَسْبُهٗ کا مصداق بن سکے۔ چھٹیں منزل استعارے میں بیان کی گئی ہے کہ باغ ہرا ہو جائے گا اور پھولوں میں پھل آجائیں گے یعنی مقصود و مطلوب حاصل ہو جائے گا۔

ساتویں منزل فنافی التوحید ہو جانا ہے۔ یہی مقام وحدت الوجود ہے۔

حافظ نے اس غزل میں جن مدارج کا ذکر کیا ہے ان کی مطابقت میں انکی دوسری غزلوں میں بہت سے اشعار موجود ہیں اس لیے اس غزل سے ان کے بہت سے اشعار کو سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

نسخوں کے فرق اور شارحین میں اختلاف کے سبب ان کا ناقدانہ جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ قارئین پر واضح ہو جائے کہ جس متن کو قبول کیا گیا ہے اور جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہی درست اور قابل قبول ہے۔

سیردس نیروسنے حافظ کے اشعار کی درجہ بندی کی ہے اور بعض مشکل اشعار کی وضاحت کی ہے۔ اس میں سے یہ غزل نقل کر کے اس پر ضروری تبصرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ بر سر آنم کہ گر ز دست بر آید — دست بہ کاری زنم کہ غصہ سر آید
۲۔ منظر دل نیست جای صحبت اضداد — دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید
۳۔ صحبت حکام ظلمت شب یلداست — نور ز خورشید خواہ بو کہ بر آید
۴۔ بر در ارباب بی مروت دنیا — چند نشینی کہ خواجہ کی بدر آید
۵۔ ترک گدائی مکن کہ گنج بیابی — از نظر رہروی کہ در گذر آید
۶۔ صالح و طالح متاع خویش نمودند — تا کہ قبول افتد و چہ در نظر آید
۷۔ بلبل عاشق تو عمر خواہ کہ آخر — باغ شود سبز و شاخ گل ببر آید
۸۔ غفلت حافظ در این سراچہ عجب نیست
ہر کہ بہ میخانہ رفت بی خبر آید

بعض ابیات کے معانی کی طرف سیردس نیروسنے مندرجہ ذیل اشارے کیے ہیں۔

بیت دوم : دیو، شاہ محمود، فرشتہ، شاہ شجاع۔
بیت پنجم : گدائی، سیر سلوک سالک۔
بیت ششم : صالح، شاہ شجاع، نیکوکار۔
طالح، شاہ محمود، بدکار، صنعت ضدین است۔
بیت ہفتم : بلبل، حافظ۔

ای حافظ تو امیدوار باش — ترجمہ: اے حافظ تمھیں اپنی زندگی

که زنده بمانی، باغ شیراز — کی امید رکھنا چاہیے، شیراز کا باغ
سبز و پر گل خواهد شد و شاه — سبز اور پر گل ہو جائے گا۔ شاہ
شجاع به شیراز باز گشت خواهد — شجاع شیراز واپس آئے گا اور
کرد، او بهار را به شیراز خواهد — وہ شیراز میں بہار لائے گا۔
آورد۔

سیروس نیرو نے بعض ابیات اور الفاظ کے معانی کی طرف جو اشارے کیے ہیں ان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک نہ ان اشعار میں کوئی ربط ہے اور نہ جذبہ و فکر کی ہم آہنگی ہے۔ حالانکہ یہ حافظ کے مزاج کے خلاف ہے بلکہ کسی بھی بڑے شاعر کے کلام میں یہ نقص نہ ملے گا۔ دوسرے اور چھٹیں شعر میں دیو اور فرشتہ اور صالح و طالح کا جو مفہوم بتایا گیا ہے وہ بعید الفہم ہے،

ساتویں شعر کا مفہوم بھی صرف ان کی ذہنی اختراع ہے ظاہر ہے کہ اشعار میں جب ربط ہی نہیں تو جو معنی چاہا پہنا دیا۔ چھٹے شعر پر ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف دوسرے شعر کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ پہلے مصرع منظر دل نیست جائے صحبت اضداد، کو محمد قزوینی نے یوں لکھا ہے خلوت دل نیست جائے صحبت اغیار۔

غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منظر دل کے بجائے بلیغ لفظ خلوت دل ہے اور "صحبت اضداد" بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس سے جمع ضدین ظاہر ہوتا ہے جو محال ہے۔ اس لیے "صحبت اغیار" موزوں ہے۔ اس سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

آقای حسین پژمان اور بعض دوسرے مرتبین نے بھی شعر کو نقل کرنے میں وہی غلطی کی ہے جو سیروس نیرو نے کی ہے۔ اسی طرح بعض حافظ شناسوں اور شارحین کو اشعار کے مفہوم میں اشتباہ ہوا ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے ان بحثوں کو قلم انداز کرنا پڑا۔

دیوان حافظ کے مختلف نسخوں میں بڑا فرق و اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلہ میں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ محض قدامت نسخہ کی بنا پر کسی متن کو قابل اعتبار نہیں قرار دیا جا سکتا مصنف کی ذاتی تحریر کی عدم موجودگی میں تصحیح متن کے لیے امثال و نظائر اور قیاسات ہی سے کام لیا جائے گا۔ (باقی)

مراجع

۱۔ قرآن کریم ۲۔ دیوان حافظ مرتبہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی ۳۔ دیوان حافظ مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد ۴۔ گنج مراد نوشتہ و تالیف سیروس نیرو چاپ ۱۳۶۲ ناشر انتشارات و تحقیقات سرزمین ایران ۵۔ دیوان مولانا شمس الدین محمد حافظ شیرازی باہتمام حسین پژمان چاپخانہ مروی چاپ سوم ۶۔ دیوان حافظ مرتبہ سید ابوالقاسم انجوی ۷۔ دیوان حافظ مرتبہ دکتر خلیل خطیب رہبر ۸۔ دیوان مولانا شمس الدین محمد حافظ شیرازی باہتمام دکتر یحیی قریب چاپخانہ مروی چاپ سوم ۹۔ حافظ صحت کلمات و اصالت غزلہا تحقیق از مسعود فرزاد از انتشارات دانشگاہ پہلوی شیراز الف تا پایان ز ۱۰۔ دیوان حافظ مرتبہ جلال نائینی و پروفیسر نذیر احمد ۱۱۔ کیمیائے سعادت نولکشور ایڈیشن ۱۲۔ فصوص الحکم ترجمہ مولوی عبدالقدیر صدیقی ۱۳۔ مثنوی مولانا روم ۱۴۔ منطق الطیر خواجہ فرید الدین عطار ۱۵۔ تصوف (حصہ اول) سید حیدر اشرف کچھوچھوی۔

قدیم ہندوستان میں طب

از

جناب حکیم عبدالباری صاحب

(۲)

چرک قدیم ہندی طب میں چرک کا نام مشہور زمانہ تھا اس کے دور کی تعین کے سلسلے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ پاتینی سے پہلے گزرا ہے جو چھٹی صدی قبل مسیح سے بھی کچھ پہلے پیدا ہوا تھا اس دعویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ پاتینی نے اپنے کچھ سوتروں میں چرک کا ذکر کیا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ پاتن جلی نے چرک کی کتاب کی ایک شرح لکھی جس کی تصدیق چکرپانی دت نے کی۔ اس بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ اگر پاتن جلی تقریباً ۱۷۵ قبل مسیح میں زندہ تھا تو چرک لازماً اس سے پہلے گزرا ہوگا۔[1]

مہاتما بدھ کے پیروؤں کی روایت کے مطابق یہ کنشکا راجہ کا درباری طبیب تھا بد قسمتی سے خود راجہ کی تاریخ میں اختلاف ہے اس سلسلے میں تین رائیں ملتی ہیں بعض ۵۸۰ قبل مسیح میں وکرم سے، بعض ۷۸ء میں ساکا حکومت سے اور بعض

[1] Indian system of Medicine. O.P. Jaggi جلد چہارم، مطبوعہ دہلی لکھنؤ ۱۹۸۱ ص ۴۲۔

۱۲۳ عیسوی سے جوڑتے ہیں لیکن اکثر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ کنشکا دوسری صدی عیسوی کے وسط (تقریباً ۱۲۵ سے ۱۵۰ء) تک حکمراں تھا۔[1]

چرک کی تالیف چرک سمتھا ہندی طب کی قدیم مستند کتابوں میں اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آتری کے شاگرد اگیتویسا کی تصنیف کی تنقیح ہے جس کو چرک نے خود نظر ثانی کے بعد لکھا ہے چرک کی اس تنقیح شدہ کتاب پر دریدہ بالا نے نظر ثانی کی۔ اس لحاظ سے چرک کی موجودہ شکل کئی تنقیحات کا عکس اور مذہب فلسفہ اور طب سے ممزوج ہے۔

چونکہ چرک نے طب کے فلسفیانہ پس منظر کو بیان کرکے اس کا رشتہ مذہبی فکر اور ہندوؤں کی روحانی زندگی اور خیالات کے مختلف پہلوؤں سے جوڑا ہے اس لیے وہ سشرت اور واگبھٹ سے سبقت لے گیا۔[2]

چرک کا علم تشریح زیادہ تر بیرونی مشاہدہ پر مبنی ہے اس کے بقول انسانی جسم میں ۳۰۶ ہڈیاں ہیں اس نے بدن کے مختلف اعضا اور حجم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بیماری سہ گانہ اخلاط (تری ورشا) باد، صفرا اور بلغم کے باہمی خلل اور عدم توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ ۸۰ بیماریاں باد کی خرابی سے ۴۰ صفرا کی خرابی سے اور بے شمار بیماریاں بلغم کی خرابی سے لاحق ہوتی ہیں جن امراض کی تصویر کھینچی گئی ہے ان میں سے معدہ کی آٹھ، جذام کی سات، احتباس بول

[1] Studies in the Medicine of Ancient India

[2] Hindu Medicine, Zumer ۹۹ A.F.R.Hoernole ص ۵۲-۵۳۔

کی آٹھ، اسہال کی چھ، قلۃ الدم کی پانچ، ضیق النفس (دمہ)، ہچکی، سر کے امراض جنون اور تلی کے امراض میں سے ہر ایک کی پانچ مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں۔ سل و دق کی پانچ مختلف قسمیں ہیں۔ ۱۔ بادی ۲۔ صفراوی ۳۔ بلغمی ۴۔ قروحی ۵۔ ذبولی پرمیو (کثرۃ البول)، کی ۲۰ قسمیں ہیں جن میں سے دس بلغم کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں اور چھ صفرا کی زیادتی سے۔ ان سب کا علاج ممکن ہے البتہ چار بادی امراض ناقابل علاج ہیں جو پرمیو باد کے سبب سے ہوتا ہے اس کی علامتیں یہ ہیں۔ گوشت کا ڈھیلا ہو جانا، حلق کی خشکی، منہ میں مٹھاس کا احساس ہتھیلیوں اور تلوؤں میں سوزش اور پیشاب میں چیونٹیاں لگنا۔ جب قارورہ نرم و ملائم اور شہد جیسا میٹھا دکھائی دے اور ساختیں نمایاں طور سے لطیف نظر آئیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ باد کے ہیجان کی وجہ سے مرض پیدا ہوا ہے۔ مذکورہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندی اطباء ذیابطیس شکری سے واقف تھے۔

بخار پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے ان کی دس بڑی قسمیں ہیں تین باہم مخلوط خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ خواہش نفسانی کی وجہ سے باد اور غیظ و غضب کی وجہ سے صفرا میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور ارواح خبیثہ کے میل جول رکھنے کی وجہ سے تمام تینوں کمزوریاں ہیجان میں آجاتی ہیں۔ اکثر ابتدائی بخار میں غذا سے پرہیز کی ہدایت کی گئی ہے۔ بخار کی شدت میں کمی ہونے کے بعد آش یا دلیا یا حریرہ دینا چاہیے۔

مصنف نے قوت باہ کی افزائش کے لیے مقوی باہ ادویہ کے استعمال کا تذکرہ کیا ہے اور پھر مقوی باہ اشیاء کی لمبی فہرست بھی درج کی ہے جس میں

گولیاں، مختلف قسم کے دودھ دہی، چھاچھ، عصارے، کیک اور فالودے شامل ہیں۔

چرک سمہتا مخزن الادویہ اور بے شمار نباتاتی، حیوانی اور معدنی مادوں پر مشتمل ہے، علم السموم کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور سانپ کے کاٹے ہوئے کا علاج بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے، بیماریوں کی تشخیص اور ان کے انجام کی پیشین گوئی میں خوابوں کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے، مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ آب و ہوا، موسم، غذا اور رہن سہن کے طریقے رفتار مرض اور اسکی نشو و نما پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں یہ تمام اسباب و علل اخلاط ثلاثہ (تری دوشا) باد، صفرا اور بلغم کو ہیجان میں لے آتے ہیں اور بیماری پیدا کرتے ہیں۔

چرک سمہتا اگرچہ ایک طبی کتاب ہے تاہم جراحی سے متعلق بھی اس میں چند فصلیں ہیں استسقا میں عمل نزل کو بیان کیا گیا ہے، یہ عمل پیٹ کے بائیں جانب ناف سے نیچے انجام دینا چاہیے اور نلکی کے ذریعہ پانی کو خارج کرنا چاہیے، پانی خارج ہوتے رہنے اور شکم پر دباؤ پڑے رہنے کے لیے طبیب کو پیٹ پر کپڑا کس کر باندھنا چاہیے۔

آنتوں کے پھٹ جانے یا ان میں سوراخ ہو جانے کی حالت میں آنتوں کو کیڑوں مکوڑوں کے ذریعہ کٹوایا جائے جب سوراخ دکھائی دینے لگے تو کیڑوں کو گردن سے کاٹ ڈالا جائے اور ان کے منہ آنتوں کے اندر گڑے ہوئے ہوں۔ اس کے بعد آنت کو پیچھے ڈھکیل کر ٹھیک مقام پر لایا جائے اور شگاف دیا جائے اس کے بعد سوئی کے ذریعہ ٹانکے لگا دینا چاہیے۔

سشرت | یہ جراح کی حیثیت سے زیادہ معروف اور مشہور ہے یہ ایک پجاری وشوامتر کا بیٹا تھا، جس طرح چرک کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دیوداس (مہاراجہ بنارس) کا مجسمہ یا روپ تھا اسی طرح سشرت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دھنونتری کا روپ

تھا جس نے اس کو تعلیم دی۔

اس کی کتاب سشرت سمہتا ایک عظیم تصنیف سمجھی جاتی ہے جو قدیم ہندوستانی طب کا ایک اہم ماخذ اور سرجری کے متعلق بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے، لیکن اس وقت اس نام کی مروج کتاب وہ کتاب نہیں ہے[1]۔ بلکہ سشرت "اکبر" کی اصل کتاب شلیا تنتر (Salya Tantra) ہے بعد میں نامعلوم سشرت اصغر نے اس پر نظر ثانی کی اور اس میں مفید اضافے کیے، اضافہ شدہ حصہ کو "اتراتنتر" (Uttra tantra) کے نام سے موسوم کیا اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ اصل حصہ جس کا اس نے تکملہ اور ضمیمہ لکھا وہ سشرت "اکبر" کا ابتدائی تنتر تھا اور اسی کا حوالہ گے داس کی شرح میں ملتا ہے، تکملہ نگار کا نام سشرت سمہتا کے مشہور شارح ڈھلن کے مطابق ناگارجن تھا جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے[2]۔

سشرت اصلاً ایک سرجن تھا اور اسے طب سے زیادہ سرجری سے دلچسپی تھی تاہم اس نے اپنی کتاب میں بیماریوں کے علاج، ادویہ اور ان کے خواص، اغذیہ، علم تشریح، علم امراض، علم سموم (زہروں کا علم)، فن ولادت اور اختلافات طب وغیرہ پر بحث کی ہے۔ اور جراحی کے ایسے آلات کا ذکر کیا ہے جن کی طرف چرک سمہتا میں نشاندہی نہیں کی گئی ہے[3]۔

---

[1] اصل کتاب ہرنلے کے مطابق تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح میں اور جی این مکھوپادھیائے کے مطابق... ۱ قبل مسیح سے پہلے لکھی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف انڈین میڈیسن ایڈیٹر ایس کے رام چندر راؤ جلد اول مطبوعہ بنگلور ۱۹۸۵ء ص ۹۴۔

[2] P. Kutumbiah Ancient Indian Medicine ص xxx (انٹروڈکشن)

[3] سشرت نے مکمل دو فصلوں (سوتر استھان کی ساتویں اور آٹھویں فصل) میں سرجری سے متعلق آلات کا ذکر کیا ہے اور ایک فصل (پچیسویں) میں آپریشن کے اصولوں پر گفتگو کی ہے، چرک نے اپنی کتاب میں صرف دو مقامات پر تشریحی عمل کو بیان کیا ہے۔

سشرت سمہتا کے ابواب و فصول

سشرت سمہتا اپنی موجودہ شکل میں چھ کتابوں (استھانوں) پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۸۴ فصول (ادھیائے) ہیں لیکن اصل سمہتا صرف پانچ کتابوں (استھانوں) اور ۱۲۰ فصلوں (ادھیائے) پر مشتمل تھی۔ اس تعداد کا ذکر سشرت سمہتا کے سوتر استھان ۳ میں ملتا ہے۔ کتاب اول (سوتر استھان) میں ۴۶ فصلیں، کتاب دوم (ندان استھان) میں ۱۶ فصلیں، کتاب سوم (شاریر استھان) میں ۱۰ فصلیں، کتاب چہارم (چکتسا استھان) میں ۴۰ فصلیں اور کتاب پنجم (کلپ استھان) میں ۸ فصلیں ہیں۔

کتاب اول میں آٹھویں فصل کے بعد کتاب ششم یعنی "اتراتنتر" کا ذکر ملتا ہے۔ ابتدائی پانچ کتابوں میں خاص طور سے سرجری سے بحث کی گئی ہے لیکن آخری کتاب (ضمیمہ) میں آیورویدا کی دوسری چھ شاخوں (شالاکیہ تنتر، کمار تنتر، کائے تنتر، بھوت تنتر، رسائن اور واجی کرن) پر بااجمال گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب اول میں طب کے مطالعہ سے متعلق ابتدائی اور بنیادی باتوں کے علاوہ جراحی آلات و اعمال کو بیان کیا گیا ہے امراض کی تقسیم ان کے انجام کی تفصیل، ادویہ کی تقسیم اور ان کی خصوصیات کا ذکر بھی اس میں شامل ہے۔

کتاب دوم میں مختلف امراض کی ماہیت، سبب اور علامت پر بحث کی گئی ہے

کتاب سوم تشریح اور منافع الاعضاء پر مشتمل ہے اس میں انسانی ساخت، روح اور جنین کی نشو و نما کی وضاحت کی گئی ہے اور جسم کے اعضائے رئیسہ اور حمل و ولادت سے متعلق امور کو بیان کیا گیا ہے۔

کتاب چہارم میں مختلف امراض کے علاج کی تفصیل ہے اولاً قروح، زخم معدہ، بواسیر اور ہڈی کے ٹوٹنے کا بیان ہے پھر دوسری بیماریوں امراض گردہ و مثانہ اور

امراض حلق وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب پنجم میں نباتات، حیوانات اور معدنیات کے سموم (زہروں) کا ذکر ملتا ہے اس کا آغاز عام غذاؤں میں زہر کی شمولیت سے کیا ہے اور اختتام کیڑوں مکوڑوں کے کاٹنے کے زہریلے اثرات پر ہوا ہے۔

سشرت سمہتا کے اضافہ شدہ حصہ کو کتاب ششم کا نام دیا گیا ہے اس میں ۶۶ فصلیں ہیں جن کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں ۲۶ فصلیں ہیں اور ان کا تعلق معمولی سرجری سے ہے شروع کی ۱۹ فصلوں میں امراض چشم اور ان کے علاج پر بحث کی گئی ہے اس کے بعد دو فصلوں میں کان کے امراض، پھر تین فصلوں میں ناک کے امراض اور آخری دو فصلوں میں سر کے امراض بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ کی بارہ فصلوں میں بچوں کی بیماریوں کا ذکر ہے، اس میں بچوں کو متاثر کرنے والے امراض ساتھ ساتھ ارواح بد کا بھی ذکر ہے۔ تیسرے حصہ میں ۲۱ فصلیں ہیں اور ان میں عام بیماریوں بخار، دست، رسولی، قلتہ الدم، یرقان، جریان خون، امراض قلب اور دمہ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے چوتھا حصہ تین فصلوں پر مشتمل ہے اور ان میں صرع، پاگل پن نیز انکے مافوق الفطرت اسباب اور عام طبی پہلوؤں کا بیان ہے آخری حصہ کی چار فصلوں میں چھ ذائقوں، حفظان صحت کے اصول اور طبی اصطلاحات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

سشرت سمہتا کئی اعتبار سے نمایاں ہے اس کی جس فصل میں امراض چشم کا ذکر ہے اس میں آنکھوں کے امراض کی ۷۶ قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں ۵۱ قسموں کا تعلق آپریشن سے ہے اس کے علاوہ اس میں ۱۰۱ کند اور ۲۰ تیز آلات کا ذکر ملتا ہے کند اوزار میں Pince (سنسی) Hooks (کانٹا) اور Tubes (ٹیوب) وغیرہ شامل ہیں اور تیز اوزار میں

چاقو، قینچی، آرہ، سوئی وغیرہ ہیں۔ جراحی کی مختلف قسموں کو بیان کیا گیا ہے مثلاً شگاف دینا (Excision) پچھنے لگانا (Scarefication) جونک سے ہوا کھینچ لینا (Asfirotion) ٹانکے لگانا (suturing) کسی جوف سے فاسد مادے نکالنا (Evacnation)

دایہ گری (قبالت) کی فصل میں مشکل اور پیچیدہ زچگی اور وضع حمل کی مختلف شکلوں پر بحث کی گئی ہے Caesarian Section (عمل قیصری) کو انجام دینے کی واضح ہدایت دی گئی ہیں۔ اس میں جراحی عمل کی تقریباً ۳۰۰ قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ٹوٹی ہڈی، عظم طحال اور بواسیر کے آپریشن جیسے مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے اور ڈریسنگ کی ۱۴ قسموں پر روشنی ڈالی گئی ہے[1] سشرت سمہتا میں ۱۱۲۰ امراض کا تذکرہ مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت کیا گیا ہے ۱۔ ضرب و زخم سے ہونے والے جسمانی امراض ۲۔ بڑھاپے کی وجہ سے فطری ضعف ۳۔ ذہنی اختلال۔

سشرت کی مخزن الادویہ بہت مفید اور قیمتی مواد پر مشتمل ہے اس میں دوا میں کام آنے والے ۷۰۰ سے زیادہ پودوں کا تذکرہ ہے اور چرک سمہتا کے مقابلہ میں نباتاتی ادویہ کی تعداد زیادہ ہے لیکن حیوانی ادویہ کی تعداد چرک سمہتا میں ۱۷۷ اور سشرت سمہتا میں صرف ۵۷ ہے، البتہ معدنی ادویہ کی تعداد ۶۴ ہے جو دونوں میں یکساں ہے[2]

واگبھٹ | ہندی طب کی تیسری شخصیت واگبھٹ کی ہے اس نام کے دو شخص تھے، واگبھٹ اول نے جنرل میڈیسن پر اشٹانگ سنگرہ (Astanga samgraha) نام کی کتاب لکھی جو سشرت کی کتاب کے طرز پر چھ فنون میں منقسم تھی اس کا مقصد

[1] انسائیکلوپیڈیا آف انڈین میڈیسن، مطبوعہ بنگلور ۱۹۸۵ء ص ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۷-۹۶۔

اپنے دور میں رائج مختلف طبی نظام کو بالخصوص چرک اور سشرت کی کتابوں میں شامل نظام طب کو جمع کرنا تھا۔ اشٹانگ سمگرہ کا کثرت سے شرحوں میں حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس میں نظم و نثر دونوں ممزوج ہیں، واگبھٹ ثانی کی اشٹانگ ہردیا (Astang Hrdya) کے مقابلہ میں اس کا چرک اور سشرت سے زیادہ تعلق ہے اور جداگانہ نوعیت کے مواد پر مشتمل ہونے کیوجہ سے اسکی زیادہ اہمیت ہے۔

واگبھٹ اول کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اسکی نشو و نما چھٹی صدی عیسوی کے اواخر یا ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی ہوگی۔ ایک بودھی زائر اٹسنگ (Itsing) نے نالندہ (بہار) کی عیسائی خانقاہ میں ۶۷۵ء سے ۶۸۵ء تک دس سال گزارے تھے وہ اپنی کتاب (Reeord of Buddist Practiees) میں بیان کرتا ہے کہ طب کی آٹھ شاخیں پہلے ہی سے آٹھ کتابوں میں موجود تھیں جن کا خلاصہ ایک شخص نے تیار کر کے ایک کتاب میں مکمل کیا۔ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ہندوستان کے ہر حصہ کے طبیب اسی کتاب سے مستفید ہوتے تھے۔[1]

واگبھٹ ثانی کے اپنے بیان کے مطابق اسکی کتاب واگبھٹ اول کی تلخیص (اشٹانگ سمگرہ) پر مبنی ہے۔ اس میں طب کا مکمل بیان ہے اور سرجری سے متعلق بھی کسی قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ سشرت کے طرز پر اسکی ترتیب سے مشابہ ہے اور چھ استھانوں (خنون) اور ۱۲۰ فصلوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے واگبھٹ اول کی اشٹانگ سمگرہ کا ذکر ایک اہم اور خاص ماخذ کی حیثیت سے کیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ وہ آٹھویں یا نویں صدی عیسوی میں گزرا ہوگا۔[2]

۱۔ Medicine of Ancient India. A.F.R. Hoernle ص ۱۰

۲۔ Kutumbiah Ancient Indian Medicine مطبوعہ ۱۹۶۹ء ص XXXVI

شارحین و مترجمین

شارحین میں چکرپانی دت (Chakra panidatta) اہم شخص ہے۔ اس نے ۱۰۶۶ء میں چرک سمہتا کی ایک مکمل اور مستند شرح لکھی اور اس کا نام چرک تات پری ٹیک" (charaka Tatparya Tika) یعنی چرک کے معنی و مفہوم کی توضیح و تشریح رکھا۔ اس کے علاوہ اس نے سشرت سمہتا پر بھنومت (Bhanu mati) کے نام سے ایک شرح لکھی، مگر بدقسمتی سے اب صرف اس کا ایک حصہ ہی باقی رہ گیا ہے اور وہ سوتر استھان (Sutra sthana) پر ہے، اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ "چکرپانی" کی شرح مکمل سمہتا پر حاوی تھی۔ چرک اور سشرت سمہتا کے مطالعہ کے لیے یہ دونوں شرحیں اہم ہیں۔ شارح نے اپنی شرحوں میں متعدد مصنفین خصوصاً آتری کی کتابوں کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ آتری کے شاگردوں کے یہ تنتر (Tantras) اس کے دور میں دستیاب تھے مگر اب موجود نہیں ہیں ہرنلے (Heernle) کا خیال ہے کہ بھنومت (Bhanu mati) شرح سشرت کے موجودہ مخطوطات کے مطالعہ میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔[1]

سشرت سمہتا کی سب سے اہم شرح ڈھلن (Dallana) کی ہے جو نبندھ سمگرہ کے نام سے موسوم ہے یعنی "شرحوں کی تلخیص"۔ اس کتاب کے اقتباسات ہمادری (Hemadri) اور واچسپتی (vachaspati) نے نقل کیے ہیں اور ڈھلن نے خود چکرپانی دت کے حوالے دیے ہیں اس لیے اس کو بارہویں صدی عیسوی کی تصنیف تصور کیا جاتا ہے اس نے اکثر گے داس (gay dasa) کی

۱۔ Journal of Royal Asiatic sosety. A.F.R. Hoernle مطبوعہ ۱۹۰۶ء ص ۲۸۸-۸۹۔

ایک شرح بن جیک (یا کو دسیک) کا حوالہ دیا ہے[1]۔

واگبھٹ ثانی کی مرتب و مدون کتاب کی شرح ارن دتا (Arundatta) نے "سروانگ سندری" (طب کی تمام شاخوں میں سب سے بہتر) کے نام سے لکھی یہ سنہ ۱۲۳۰ء میں گزرا ہے۔

قدیم ہندوستانی طب کا طبعزاد دور چرک اور سشرت کی سمہتاؤں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے ان دونوں کی تصانیف ہندی طب میں بہت ہی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اور آج بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

چرک سمہتا کا انگریزی ترجمہ کوی رتن اوینا ش چندر (Kaviratna Avinash chandra) نے بحسن و خوبی انجام دیا (۱۸۹۰ — ۱۹۱۱) اور سشرت سمہتا کو انگریزی کے قالب میں کوی راج کنج بھیشا گرتن (Kaviraj Kunjalal Bhishagratna) نے ڈھالا (۱۹۰۷ — ۱۹۱۸) ان تراجم کی مدد سے انگریزی داں طبقہ کو ہندوستانی طب کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔

چرک اور سشرت کے ابتدائی انگریزی اڈیشن اب دستیاب نہیں البتہ چرک سمہتا کا ایک نیا ترجمہ جمنا گر (Jamnagar) انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۵۵ء میں چھ جلدوں میں شایع کیا ہے

چرک کا عربی ترجمہ فارسی زبان سے عبداللہ بن علی نے کیا لیکن فارسی ترجمہ کے مترجم کا نام نہیں معلوم غالب گمان یہ ہے کہ اس کو فارسی میں منکہ نے منتقل کیا ہوگا۔

---

[1] A.F.R.Hoernle Journal of Royal Asiatic Souity مطبوعہ ۱۹۰۶ء

Studies in Medicine of Ancient India-۲۰۰۰۸۹ ص ۱۷

سشرت کی کتاب کو ہندوستانی طبیب منکہ نے یحییٰ بن خالد کے ایما سے عربی میں منتقل کیا اشٹانگ ہرویا کا نام ابن ندیم نے استنکر اور ابن ابی اصیبعہ نے اسنکر لکھا ہے اس کو عربی میں ابن دھن نے منتقل کیا یہ ترجمے عہد عباسی میں کیے گئے[1]۔

اس میں ابتدائی دور سے ترقی پذیر دور تک کی ہندی طب اور چرک سشرت اور واگبھٹ کے حالات اور طبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے ان مصنفین کے دور میں طب ہندی بام عروج پر تھی اور اسے Triad of the ancients یعنی قدمار کا گروپ کہا جاتا ہے۔

اوپر جن اطبا کا ذکر آیا ہے ان کے علاوہ بھی ہندوستان میں متعدد مشہور اور صاحب تصانیف اطبا گذرے ہیں لیکن ان کا استقصا ممکن نہیں۔

علم السموم اور ادویہ کے مواد میں ہندوستانی اطبا کے معلومات ان کے معاصرین سے کم نہ تھے، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ چرک نے پانچ سو اور سشرت نے تقریباً سات سو ساٹھ دوا میں کام آنے والے پودوں کا تذکرہ کیا ہے علاج کی غرض سے جو دوائیں وہ تیار کرتے تھے ان میں بھی غیر معمولی حذاقت نظر آتی ہے وہ بہت سے معدنی اجزا مثلاً سونا، چاندی، تانبہ، رانگا، قلعی اور جستہ استعمال کرتے تھے۔ خاص طور سے پارہ، گندھک، سنکھیا، اقلیمیا (روپا مکھی، سونا مکھی (Lead Sulphate)، بورق، پھٹکری، ہیرا کسیس اور سرمہ کی تعریف کرتے تھے۔ پارہ کو بطور دوا ویدوں نے بھی استعمال کیا ہے اور یہ پہلے جلدی امراض میں استعمال ہوا۔ انھوں نے پارہ کے مرکبات کی تیاری کی ترکیب عرب کیمیا دانوں سے سیکھی اور افیون کو

---

[1] زبیر احمد صدیقی، اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر مطبوعہ کلکتہ ۱۹۵۹ص ۲۰ و ۲۱۔

بھی ان ہی سے سیکھا۔

سریریاتی طب میں ہندوستانی ویدوں نے بہت سی بیماریوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے علاج میں اپنے معاصرین کی طرح ذہانت کا ثبوت دیا ہے بعض کا خیال ہے کہ ہندوستانی وید ذیابطیس شکری میں قارورہ کے میٹھے مزہ سے واقف تھے۔

بطور حفظ ما تقدم چیچک کے آبلوں سے مواد حاصل کر کے اس کے ٹیکے لگانے کا عملی طریقہ قدیم ہندوستان میں رائج تھا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ٹیکہ کا بیان اتھر وید میں ہے۔ پہلی مرتبہ شدید زہریلی چیچک کو بھاؤ پرکاش میں جو چھٹی صدی عیسوی کی تالیف ہے بیان کیا گیا ہے۔ چیچک کے علاج کے لیے گائے کی مصنوعی چیچک سے حاصل کیا ہوا چیچک کا مادہ (ویکسین) اٹھارہویں صدی عیسوی میں جینر کی دریافت کے بعد ہندوستان میں متعارف ہوا۔ بعض کا قول ہے کہ ویدوں نے چیچک کے جدید طریقہ علاج کو مقبول بنانے کے لیے اس کو قدیم ہندوستانی طریقہ کی حیثیت سے پیش کیا اور چند قدیم طبی مخطوطات کی روشنی میں اس نظریہ کی توضیح کی۔ جس کے نتیجہ میں یہ کہانی مشہور ہوگئی کہ چیچک کے ٹیکہ کا طریقہ قدیم دور تقریباً ۵۵۰ء سے ہندوستان میں رائج اور دھنونتری کی اصل کتاب میں درج تھا، حالانکہ چرک، سشرت اور واگبھٹ کی تصانیف میں چیچک کے ٹیکہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

جراحی میں قدیم ہندی اطبا اپنے ہم عصروں سے سبقت لے جا چکے تھے ترقیع الانف (Rhinoplasty) کے علاوہ انھوں نے کانوں اور ہونٹوں کی جراحی کا بھی کام کیا ہونٹوں کے لیے اعمال جراحی میں ٹانکے لگانے کے لیے باموں کو استعمال کیا بسا اوقات مکوڑوں کو ٹانکوں کے لیے استعمال کیا۔ ٹانکے لگانے کا یہ طریقہ قدیم شمار کیا جا سکتا ہے

بعد میں اس طریقہ کو ابو القاسم زہراوی (۹۳۶-۱۰۱۳ء) اور برونو لانگ برگ (۱۲۵۲ء) نے پیش کیا۔ ہندی جراحی میں عمل تخذیر (Anesthesia) استعمال کیا جاتا تھا۔ بھوج پربندہ (تقریباً ۹۸۰ء) نے ایک ایسی دوا کا ذکر کیا ہے جس کو سموہنی کہا جاتا تھا اور جس کو سونگھنے سے بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی ہندوستان میں تخذیر بالتنفس (Inhalation Anaesthesia) کی یہ اولین مثال معلوم ہوتی ہے۔

طب بیطاری میں ہندی اطبا نے چند کارنامے انجام دیے اشوک بادشاہ نے جانوروں کے علاج کے لیے ایک دواخانہ قائم کیا تھا اور سیلون کے بادشاہ بدھ داسا نے چوتھی صدی عیسوی میں اپنی فوج کے سپاہیوں کے لیے طبیبوں کو اور گھوڑوں اور ہاتھیوں کے لیے بیطاروں کو مقرر کیا تھا۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد ہندوستان و یونان کے مابین تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے اور ہندوستان کے طبی علوم و فنون یونانی وراثت کا ایک جز بن گئے یونانی اطبا نے ہندی تہذیب و ثقافت اور طبی علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ خود اسکندر کے ہمراہ ہندی اطبا تھے اسلامی عہد میں عربوں کے طبی علوم و فنون کے ارتقا میں ہندی طب ایک موثر عنصر ثابت ہوئی۔ بغداد کے مشہور خلیفہ ہارون رشید نے ۷۷۳ء میں دار الخلافہ بغداد کے نئے طبی مدرسہ میں درس و تدریس کے لیے ہندی طبیبوں منکہ و صالح کو طلب کیا۔

ہجرت سے پہلے مدینہ کی درسگاہیں

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

بیعت عقبہ اولی کے بعد ہی مدینہ منورہ میں قرآن اور دین کی تعلیم کا چرچا ہوگیا تھا اور قبیلہ انصار کی دونوں شاخ اوس اور خزرج کے عوام اور اعیان و اشراف جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے اور ہجرت عامہ سے دو سال قبل ہی وہاں مساجد کی تعمیر اور قرآن کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔

لقد لبثنا بالمدینة قبل	ہمارے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ان یقدم علینا رسول اللہ	کی تشریف آوری سے دو سال پہلے ہی
صلی اللہ علیہ وسلم سنتین	ہم لوگ مدینہ میں مسجدوں کی تعمیر اور
نعمر المساجد ونقیم الصلوٰۃ[1]	نماز کی ادائگی میں مشغول تھے۔

اس دو سالہ درمیانی مدت میں تعمیر شدہ مساجد میں نماز کے امام ان میں معلمی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، اسی کے ساتھ اس مدت میں تین مستقل درسگاہیں بھی جاری تھیں اور ان میں باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، اس وقت تک صرف نماز فرض ہوئی تھی اس لیے قرآن کے ساتھ نماز کے احکام و مسائل اور مکارم اخلاق کی تعلیم دی جاتی تھی یہ تینوں درسگاہیں

[1] وفاء الوفاء ج ۱ ص ۲۵۰۔

اس طرح جاری تھیں کہ شہر مدینہ اور اس کے انتہائی کناروں اور آس پاس کے مسلمان آسانی کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں، پہلی درسگاہ قلب شہر میں مسجد بنی زریق میں تھی جس میں حضرت رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ تعلیم دیتے تھے، دوسری درسگاہ مدینہ کے جنوب میں تھوڑے فاصلہ پر مسجد قبا میں تھی، جس میں حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ امامت و معلمی کے فرائض انجام دیتے تھے، اسی سے متصل حضرت سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ کا مکان واقع تھا جو بیت العزاب کے نام سے مشہور تھا اور جہاں مکہ مکرمہ سے آئے ہوئے مہاجرین مقیم تھے اور تیسری درسگاہ مدینہ سے کچھ فاصلے پر شمال میں نقیع الخضمات نامی علاقہ میں تھی جس میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ پڑھاتے تھے اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کا مکان گویا مدرسہ تھا۔

ان تین مستقل تعلیم گاہوں کے علاوہ انصار کے مختلف قبائل اور آبادیوں میں قرآن اور دینی احکام کی تعلیم جاری تھی اور ان کے معلم و منتظم انصار کے روساء اور اعیان او اشرات حضرات تھے، کہ مکہ مکرمہ میں ضعفاء و مساکین نے سب سے پہلے دعوت اسلام پر لبیک کہا اور وہاں کے بڑوں کے مظالم کا شکار ہوئے اور مدینہ منورہ کے مسلمانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، یہاں سب سے پہلے اعیان و اشراف اور سرداران قبائل نے برضا و رغبت اسلام قبول کر کے اس کی ہر طرح کی مدد کی، خاص طور سے قرآن کی تعلیم کا معقول انتظام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ما افتتح من مصر او مدینة	کچھ ملک اور شہر زور زبردستی سے فتح
عنوة، فان المدینة فتحت	ہوتے ہیں، مدینہ قرآن کے ذریعہ فتح ہوا[2]۔
بالقرآن۔	

مدینہ کی مذکورہ بالا تینوں درسگاہوں میں باتفاق علمائے سیر ومغازی سب سے پہلے قرآن کی تعلیم مسجد بنی زریق میں ہوئی۔

اول مسجد قرئ فیہ القرآن بالمدینۃ مسجد بنی زریق،	سب سے پہلی مسجد جس میں مدینہ میں قرآن پڑھا گیا بنی زریق کی مسجد ہے۔

پہلی درسگاہ مسجد بنی زریق

اس درسگاہ کے معلم حضرت رافع بن مالک زرقیؓ قبیلۂ خزرج کی شاخ بنی زریق سے ہیں، بیعت عقبہ اولی کے موقع پر مسلمان ہوئے اور دس سال کی مدت میں جس قدر قرآن نازل ہوا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عنایت فرمایا جس میں سورہ یوسف بھی شامل تھی اپنے قبیلہ کے نقیب رئیس تھے اور ان کا شمار مدینہ کے کاملین میں تھا، اس وقت کی اصطلاح میں کامل ایسے شخص کو کہا جاتا تھا جو نوشت وخواند، تیراندازی اور تیراکی میں ماہر اور کامل ہو، حضرت رافع بن مالک ان اوصاف کے حامل تھے، انھوں نے مدینہ واپس آنے کے بعد ہی اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم پر آمادہ کیا اور آبادی میں ایک بلند جگہ (چبوترے) پر تعلیم دینی شروع کی، مدینہ میں سب سے پہلے سورۂ یوسف کی تعلیم حضرت رافع ہی نے دی تھی اور یہاں کے پہلے معلم ومقری یہی ہیں، بعد میں اسی چبوترہ پر مسجد بنی زریق کی تعمیر ہوئی جو قلب شہر میں مصلی (مسجد غمامہ) کے قریب جنوب میں واقع تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لانے کے بعد حضرت رافعؓ کی تعلیمی و دینی خدمات اور ان کی سلامتی طبع کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے[1] اس درسگاہ کے استاد اور اکثر شاگرد قبیلۂ خزرج کی شاخ بنی زریق کے مسلمان تھے،

دوسری درسگاہ مسجد قبا

دوسری درسگاہ مدینہ کے جنوب میں تھوڑے فاصلہ پر مقام قبا

[1] طبقات ابن سعد ۳/۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۱۹۰، وفاء الوفاء ج ۳ ص ۸۵، فتوح البلدان ص ۴۵۹۔

میں بھی جہاں مسجد کی تعمیر ہوئی، بیعت عقبہ کے بعد بہت سے صحابہ جن میں ضعفائے اسلام کی اکثریت تھی۔ مکہ سے ہجرت کرکے مقام قبا میں آنے لگے اور قلیل مدت میں ان کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی، ان میں حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے وہی ان حضرات کو تعلیم دیتے تھے اور امامت بھی کرتے تھے، یہ تعلیمی سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تک جاری تھا، عبدالرحمٰن بن غنمؓ کا بیان ہے

حدثنی عشرۃ من اصحاب	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صحابہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم لوگ مسجد
قالوا کنا نتدارس العلم فی مسجد	قبا میں علم دین پڑھتے پڑھاتے تھے۔
قبا اذ خرج علینا رسول اللہ	اسی حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم فقال تعلموا	ہمارے پاس آئے اور فرمایا کہ تم لوگ
ما شئتم ان تعلموا فلن یأجرکم	جو چاہو پڑھو، جب تک عمل نہیں کروگے
اللہ حتی تعملوا[1]	اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اجر وثواب
	نہیں دے گا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبا کے مہاجرین میں متعدد حضرات قرآن کے عالم ومعلم تھے، ان میں حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ سب سے زیادہ علم رکھتے تھے اور وہی امامت کے ساتھ تدریسی خدمت میں بھی نمایاں تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے،

لما قدم المہاجرون الاولون	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
العصبۃ موضع بقباء قبل	آنے سے پہلے مہاجرین اولین کی

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۶۔

مقدم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یؤمہم سالم مولی ابی حذیفۃ وکان اکثرھم قرآنا ۔[1]	جماعت جب عصبہ آئی، جو قبا کی ایک جگہ ہے تو ان لوگوں کی امامت سالم مولی ابو حذیفہ کرتے تھے، وہ ان میں قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ رات میں حضرت سالم کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو اظہار پسندیدگی کرکے فرمایا کہ اللّٰہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں سالم جیسا قرآن کا عالم و قاری پیدا کیا ہے، نیز آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ان چاروں قرآن کے عالموں و قاریوں سے قرآن پڑھو، عبد اللّٰہ بن مسعود، سالم مولی ابو حذیفہ، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل رضی اللّٰہ عنہم، حضرت سالم ایک غزوہ میں مہاجرین کے علمبردار تھے، بعض لوگوں کو ان کی قیادت میں کلام ہوا تو انھوں نے کہا کہ بئس حامل القرآن انا، ان فررت یعنی اگر میں جنگ سے فرار ہوا تو میں برا حامل قرآن ہوں گا اور غزوہ کرتے رہے یہاں تک کہ ان کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا اور وہ بھی زخمی ہو گیا تو بغل میں لے لیا اور جب زخمی ہو کر گر گئے تو اپنے آقا حضرت ابو حذیفہ کا حال دریافت کیا اور جب معلوم ہوا کہ وہ شہید ہو گئے تو کہا کہ مجھ کو ان ہی کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ حضرت ابو حذیفہ نے سالم کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔[2] ان تصریحات سے حضرت سالم کے علم و فضل اور قرآن میں ان کے امتیاز کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ وہ قبا کی درسگاہ میں تعلیمی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

یہاں حضرت ابو خیثمہ سعد بن خیثمہ اوسی رضی اللّٰہ عنہ کا مکان گویا مدرسہ قبا کے

[1] صحیح بخاری باب امامۃ العبد والمولی، [2] الاصابہ ج ۳ ص ۵۷۔

طلبہ کے لیے دار الاقامہ تھا، وہ اپنے قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے نقیب و رئیس تھے، بیعت عقبہ کے موقع پر اسلام لائے، مجرد تھے اور ان کا مکان خالی تھا اس لیے اس میں ایسے مہاجرین قیام کرتے تھے جو اپنے بال بچوں کو مکہ مکرمہ چھوڑ کر آئے تھے یا جن کے آل اولاد نہیں تھے، اسی وجہ سے ان کے مکان کو بیت العزاب اور بیت الاعزاب کہا جاتا تھا، رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت قبا میں حضرت کلثوم بن ہدم کے مکان میں فروکش تھے اسی کے قریب حضرت سعد بن خیثمہ کا بیت العزاب تھا، رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم موقع بہ موقع وہاں تشریف لے جاتے اور مہاجرین کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے، یہ مکان مسجد قبا سے متصل جنوبی سمت میں تھا اور یہیں دار کلثوم بن ہدم بھی تھا[1] اس درسگاہ کے استاد اور شاگرد دونوں مہاجرین اولین تھے، جن میں مقامی مسلمان بھی تھے،

تیسری درسگاہ نقیع الخضمات

تیسری درسگاہ مدینہ کے شمال میں تقریباً ایک میل دور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللّٰہ عنہ کے مکان میں تھی جو حرہ بنی بیاضہ میں واقع تھا یہ آبادی بنو سلمہ کی بستی کے بعد نقیع الخضمات نامی علاقہ میں تھی، جو نہایت سرسبز و شاداب اور پرفضا علاقہ تھا، یہاں خضیمہ نام کی نرم و نازک اور خوش رنگ گھاس اگتی تھی، اسی طرف سے وادی عقیق میں سیلاب آتا تھا، بعد میں حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہ نے یہاں گھوڑوں کی چراگاہ بنائی تھی۔

یہ درسگاہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے پرکشش ہونے کے ساتھ اپنی جامعیت اور افادیت میں دونوں مذکورہ درسگاہوں سے مختلف اور ممتاز تھی، بیعت عقبہ میں

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۹۳۔

انصار کے دونوں قبائل اوس اور خزرج کے نقبا اور روساء نے دعوت اسلام پر لبیک کہکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مدینہ میں قرآن اور دین کی تعلیم کے لیے کوئی معلم بھیجا جائے تو ان کے اصرار پر آپؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو روانہ فرمایا، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو انصار کے ساتھ مدینہ روانہ فرمایا :-

فلما انصرف عنه القوم بعث	جب انصار بیعت کرکے لوٹنے لگے تو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے
معهم مصعب بن عمير بن	ساتھ مصعب بن عمیرؓ کو روانہ فرمایا
هاشم بن عبد مناف بن	اور ان کو حکم دیا کہ وہ وہاں لوگوں کو
عبد الدار بن قصي، وامره	قرآن پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں اور
ان يقرئهم القرآن ويعلمهم	ان میں دین کی بصیرت اور صحیح سمجھ پیدا
الاسلام، ويفقههم في الدين	کریں، چنانچہ حضرت مصعبؓ مدینہ میں
فكان يسمى المقرئ بالمدينة	مقری کے لقب سے مشہور ہوئے اور
مصعب، وكان منزله على	ان کا قیام حضرت ابو امامہ اسعد بن
اسعد بن زرارة بن عدس	زرارہؓ کے مکان میں تھا،
ابي امامة[1]	

حضرت مصعب بن عمیر ابتدائی دور میں اسلام لائے تھے، ناز و نعمت میں پلے ہوئے تھے، جب انکے مسلمان ہونے کی خبر خاندان والوں کو ہوئی تو انھوں نے سخت

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۳۴ - واسد الغابہ ج ۴ ص ۳۶۹ -

سزا دے کر مکان کے اندر بند کر دیا مگر حضرت مصعب کسی طرح نکل کر مہاجرین حبشہ میں شامل ہو گئے، بعد میں مکہ واپس آئے اور مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت براء بن عازبؓ کا بیان ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ خزرجی نجاری بیعت عقبہ اولیٰ میں اسلام لائے اپنے قبیلہ کے نقیب تھے، وہ انصار کے نقباء میں سب سے کم سن تھے، انکا انتقال سنہ ۱ھ میں ہوا جب کہ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہو رہی تھی، قبیلہ بنو نجار کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ ہمارے لیے کسی کو نقیب مقرر فرما دیں، آپؐ نے فرمایا کہ میں خود تم لوگوں کا نقیب ہوں، ایک قول کے مطابق وہ بیعت عقبہ سے پہلے ہی مکہ جا کر مسلمان ہو گئے تھے اور انصار مدینہ میں وہ پہلے مسلمان ہیں۔

یہ دونوں حضرات قرآن کی تعلیم اور اسلام کی اشاعت میں ایک دوسرے کے شریک تھے، حضرت مصعب بن عمیرؓ قرآن کی تعلیم کے ساتھ اوس اور خزرج دونوں قبائل کی امامت بھی کرتے تھے اور ایک سال کے بعد جب اہل مدینہ کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کا لقب مقری یعنی معلم مشہور ہو چکا تھا۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے جمعہ کی فرضیت سے پہلے ہی مدینہ میں نماز جمعہ کا اہتمام کیا، اس کی بھی امامت عام طور سے حضرت مصعب بن عمیرؓ کیا کرتے تھے، اسی لیے نماز جمعہ کے قیام کی نسبت بعض روایتوں میں انکی طرف کی گئی ہے، حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہمراہ حضرت ابن ام مکتومؓ بھی آئے تھے اور وہ بھی قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے حضرت براء بن عازبؓ کا بیان ہے۔

اول من قدم علينا مصعب	سب سے پہلے ہمارے یہاں مدینہ میں
بن عمير وابن ام مكتوم	مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ آئے

وکانوا یقرءون الناس [1]	اور یہ حضرات لوگوں کو قرآن پڑھاتے تھے

بخاری کی ایک روایت میں ہے فکانا یقرأن الناس یعنی یہ دونوں حضرات لوگوں کو پڑھاتے تھے [2] چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو خاص طور سے تعلیم کے لیے بھیجا تھا اور حضرت ابن ام مکتومؓ ان کے ساتھ تھے اس لیے اس درسگاہ کی تعلیمی سرگرمی میں ان کا تذکرہ نہیں آتا ہے، ویسے بھی ابن ام مکتومؓ نابینا تھے اور محدود طریقہ پر یہ خدمت انجام دیتے تھے، ان کا نام عمرو، یا عبداللہ بن قیس ہے، حضرت خدیجہ کے ماموں زاد بھائی اور قدیم الاسلام صحابیؓ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور سے غزوات میں ان کو مدینہ کا امیر مقرر فرماتے تھے اور وہی نماز پڑھاتے تھے، اس درسگاہ کے ایک طالب علم حضرت براء بن عازبؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی میں نے طوال مفصل کی کئی سورتیں یاد کر لی تھیں،

نقیع الخضمات کی یہ درسگاہ صرف قرآنی مکتب اور مدرسہ ہی نہیں تھی بلکہ ہجرت عامہ سے پہلے مدینہ میں اسلامی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، اوس اور خزرج کے درمیان ایک مدت سے قبائلی جنگ برپا تھی، آخری معرکہ حرب بعاث کے نام سے مشہور ہے جو ہجرت سے پانچ سال قبل ہوا تھا، ان جنگوں میں دونوں قبائل کے بہت سے آدمی مارے گئے تھے جن میں انکے اعیان واشراف بھی تھے اور دونوں قبائل باہمی کشت وخون سے چور ہو چکے تھے اسی حال میں اسلام انکے حق میں رحمت ثابت ہوا اور بقول ام المومنین حضرت عائشہؓ حرب بعاث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کا سبب بنا [3] دونوں قبائل کے

[1] بخاری باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ [2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۰۳ طبع اول بولاق مصر ۱۳۰۱ھ [3] بخاری باب ایام الجاہلیۃ۔

افراد میں باہمی نفرت کی بو باس اسلام لانے کے بعد بھی باقی تھی۔ ایک قبیلہ والے دوسرے قبیلہ کی امامت پر اعتراض کر سکتے تھے اس لیے دونوں قبائل نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کی امامت پر اتفاق کیا۔

فکان مصعب بن عمیرؓ یؤمہم	مصعب بن عمیرؓ ان سب کی امامت
وذلک ان الاوس والخزرج	کرتے تھے، کیونکہ اوس اور خزرج
کرہ بعضہم ان یؤمہ	ایک دوسرے کی امامت کو ناپسند
بعضٌ فجمع بہم اول جُمُعَۃٍ	کرتے تھے اور دونوں قبائل کو جمع
فی الاسلام۔	کرکے اسلام میں پہلا جمعہ قائم کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت حال کے پیش نظر حضرت مصعب بن عمیرؓ کو لکھا کہ اہل مدینہ کو جمعہ پڑھائیں، پہلی نماز جمعہ میں صرف چالیس مسلمان شریک ہوئے بعد میں ان کی تعداد چار سو ہو گئی، پہلے جمعہ کو ایک بکری ذبح کی گئی اور اس سے نمازیوں کی ضیافت ہوئی، جس سے دونوں قبائل کے لوگوں میں باہمی الفت اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہوا [1] اسی کے ساتھ یہودیوں کے یوم السبت کی مذہبی رونق کے مقابلہ میں یہاں کے مسلمانوں میں اس سے ایک دن پہلے عید الاسبوع (ہفتہ کی عید) کی مسرت واجتماعیت کا مظاہرہ ہوا، گویا یہودیوں کے مقابلہ میں یہ پہلا جراتمندانہ اجتماعی اور دینی مظاہرہ تھا۔

نیز نقیع الخضمات کی اس دینی درسگاہ اور اسلامی مرکز کی وجہ سے مدینہ کے یہودیوں کے دینی وعلمی مرکز بیت المدراس واقع فہر کی حیثیت کم ہو گئی جہاں وہ جمع ہو کر تدریس وتعلیم

[1] تفصیل کے لیے طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام اور وفاء الوفاء وغیرہ ملاحظہ ہو۔

اور دعا خوانی کے ذریعہ مذہبی سرگرمی جاری رکھتے تھے[۱] اور اوس وخزرج یہودیوں سے بے نیاز ہوکر اپنے علمی و دینی مرکز سے وابستہ ہوگئے، اسلام سے پہلے اوس اور خزرج میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اور اس بارے میں وہ یہودیوں کے محتاج تھے البتہ چند لوگ لکھنا جانتے تھے، ان ہی میں رافع بن مالک زرقیؓ، زید بن ثابتؓ، اسید بن حضیرؓ، سعد بن عبادہؓ، ابی بن کعبؓ وغیرہ تھے[۲] ان میں اکثر ہجرت عامہ سے پہلے مسلمان ہوکر تعلیم وتدریس میں سرگرمی دکھاتے تھے اور نقیع الخضمات کے مرکز سے ان کا خصوصی ربط وتعلق تھا اور اوس وخزرج کے مختلف قبائل اس علمی و دینی مرکز سے وابستہ تھے، ان تین مستقل درسگاہوں کے علاوہ اس زمانہ میں مدینہ کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں تعلیمی مجالس وحلقات جاری تھے، خاص طور سے بنو نجار، بنو عبدالاشہل، بنو ظفر، بنو عمرو بن عوف، بنو سالم وغیرہ کی مسجدوں میں اس کا انتظام تھا اور عبادہ بن صامتؓ، عتبہ بن مالکؓ، معاذ بن جبلؓ، عمر بن سلمہؓ، اسید بن حضیرؓ، مالک بن حویرثؓ رضی اللہ عنہم ان کے امام ومعلم تھے،

ان درسگاہوں کے نصاب تعلیم کے سلسلہ میں یہ جاننا ضروری ہے کہ اس وقت تک عبادات میں صرف نماز فرض ہوئی تھی اور بیعت عقبہ کے وقت انصار مدینہ سے بیعت نساء (عورتوں کی بیعت) لی گئی تھی یعنی یہ کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، نہ چوری کریں گے، نہ زنا کریں گے، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گے، نہ کسی پر بہتان لگائیں گے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معروف میں نافرمانی کریں گے، ان درسگاہوں میں قرآن کی

[۱] الاشتقاق لابن درید ص ۳۲۶ [۲] فتوح البلدان ص ۳۵۹۔

تعلیم کے ساتھ ان ہی امور کے بارے میں تعلیم وتربیت دی جاتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو تین باتوں کا حکم دیا تھا۔

وامرہ ان یقرئھم	ان کو قرآن پڑھائیں اور
القرآن، ویعلمھم	اسلام کی تعلیم دیں اور
الاسلام، ویفقھھم	ان میں دین کی بصیرت
فی الدین،	پیدا کریں۔

اس ہدایت کے مطابق ان درسگاہوں میں جس قدر قرآن اس مدت میں نازل ہوا تھا اس کی تعلیم دی جاتی تھی عام طور سے آیات وسور زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، انصار نے بیعت میں جن باتوں کا اقرار کیا تھا ان پر عمل کی تلقین وتاکید کی جاتی تھی، یہ درسگاہیں رات، دن، صبح، شام کی قید سے آزاد تھیں اور ہر شخص ہر وقت ان سے استفادہ کرتا تھا،

فتح نامہ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر

کچھ معروضات

از

جناب ا۔ و شاکرہ صاحبہ

ڈاکٹر نورالسعید اختر ایک لائق استاذ اور محقق ہیں انکی تحقیقی سرگرمیوں کا اصل میدان عہد وسطیٰ کے دکن کے درخشاں کارنامے ہیں۔ جولائی ۱۹۹۱ء کے معارف میں انھوں نے تاریخ دکن کے ایک نایاب نسخہ فتح نامہ محمود شاہی کی نشاندہی کرتے ہوئے اس پر ایک تحقیقی نظر ڈالی ہے جس سے بہمنیوں کے بارے میں مزید معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ تاہم کئی بہمنی بادشاہوں کے ناموں میں یکسانیت کی وجہ سے بعض واقعات اور حالات خلط ملط ہو گئے ہیں جو مجھ جیسی طالب علم کے لیے الجھن کا باعث بن گئے ہیں اس لیے لائق مقالہ نگار سے ان کی مزید وضاحت کی خواستگار ہوں تاکہ میری اور مجھ جیسے دوسرے طلبہ کی تشفی ہو سکے۔ میری حقیر معروضات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر نورالسعید نے اپنے مقالہ کے آغاز میں فتح نامہ کے ممدوح محمود شاہ بہمنی کو محمد شاہ لشکری کا بیٹا بتاتے ہوئے اس کی تخت نشینی کی تاریخ ۱۴۸۲ء جو ۸۸۷ ہجری کے مطابق ہے بتائی ہے۔ اس کے بعد سلسلہ وار بہمنی سلاطین کا مختصر ذکر کیا ہے۔ ہارون خاں شیروانی[۱]، عبدالمجید صدیقی[۲] اور فرشتہ[۳] نے بہمنی خاندان کے تمام

۱ Sherwani H.K & Joshi P.M. History (بقیہ حاشیہ ص ۳۷۱ پر)

اٹھارہ حکمرانوں کے نام دیے ہیں۔ مگر ان کے دیے ہوئے شجروں میں ایک حکمران کے نام اور کئی دوسروں کی ولدیت میں کافی فرق ہے

فتح نامہ محمود شاہی کا محمود شاہ بہمنی ڈاکٹر نورالسعید اور خود فتح نامہ میں دیے گئے سنین کے مطابق بہمنی سلطنت کا چودہواں سلطان محمود شاہ (۱۴۸۲-۱۵۱۸ء) عیسوی مطابق (۸۸۷-۹۲۴ھ) ہی ہو سکتا ہے۔ جو محمد شاہ سوم لشکری ۱۴۸۲-۱۴۶۳ء مطابق ۸۸۷-۸۶۷ھ کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس محمود شاہ کی تاریخ وفات کے بارے میں عبدالمجید صدیقی، ہارون خاں شیروانی اور فرشتہ متفق الرائے ہیں لیکن استاذ محترم پروفیسر نذیر احمد صاحب (میں انہیں اپنا معنوی استاد مانتی ہوں) اسے ۱۵۱۰ء مطابق ۹۱۵ھ قرار دیتے ہیں[۱]۔

۲۔ فاضل مقالہ نگار نے ص ۳۵ معارف جولائی ۱۹۹۱ء میں محمود شاہ کی تعریف کرتے ہوئے حافظ شیرازی کے سفر دکن کے ارادہ کا ذکر کیا ہے۔ اس حکمران کو فرشتہ نے محمود شاہ کے نام سے مخاطب کیا ہے[۲] لیکن ممتاز مورخ ہارون خاں شیروانی نے قدیم فرامین، کتبوں اور سکوں کی مدد سے تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ پانچویں بہمنی سلطان کا نام محمد شاہ ثانی تھا اور خود ڈاکٹر نورالسعید نے اپنے زیر نظر مضمون کے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۰) of Medieval Deccan V.I Bahmanis

۲ عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن ۳ فرشتہ ابوالقاسم۔ تاریخ فرشتہ حصہ اول ترجمہ عبدالحی خواجہ، مکتبہ ملت۔ دیوبند ۱۹۸۳ء

۱ Sherwani H.K & Joshi P.M. History of medieval Deccan V. II P.

۲ فرشتہ ابوالقاسم۔ تاریخ فرشتہ حصہ اول ۱۱۰-۱۰۹

فٹ نوٹ میں (معارف جولائی ۱۹۹۱ء ص۳۵) اسے محمد شاہ ثانی ہی لکھا ہے۔ برہان ماثر میں بھی محمد شاہ ہی لکھا گیا ہے اس وقت یہ کتاب پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے صفحہ کا حوالہ نہیں دیا جا سکا۔ ڈاکٹر صاحب اسے خود ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ شیروانی صدیقی نے بھی اسکا حوالہ دیا ہے[۱]۔

۳۔ عام طور سے ہمایوں شاہ بہمنی کے بارے میں مورخین کی رائے اچھی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب نے بھی اسے سفاک اور ظالم ٹھہرایا ہے لیکن شیروانی اسکے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

۴۔ محمود شاہ ثالث ۸۸۷ھ۔ ۸۶۷ھ (معارف جولائی ۱۹۹۱ء) کا نام بھی شیروانی اور صدیقی کے مطابق محمد شاہ ثالث ہے۔ اس کو تاریخ میں محمد شاہ لشکری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فرشتہ اسے محمد شاہ ثانی لکھتا ہے۔ اسی نے سازشی لوگوں اور شراب کے جال میں پھنس کر اپنے لایق وزیر محمود گاواں کو شہید کرا دیا۔

۵۔ معارف ۱۹۹۱ء ص۳۱ پر مقالہ نگار شاہ محب اللہ اور شاہ حبیب اللہ کو بھائی بتاتے ہیں لیکن معارف جولائی ۱۹۹۱ء ص۳۷ پر فتح نامہ کے حوالے سے میرزا حبیب اللہ ابن محب اللہ کا ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے چچا بھتیجے کے ایک ہی نام ہوں۔ یہ نکتہ مزید تحقیق طلب ہے۔

۶۔ یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ عہد بہمنیہ پر بہت ٹھوس کام نہیں ہوا۔ تاہم ہارون خاں شیروانی کی تصنیف بہمنی سلطنت۔ تاریخی شہادتوں۔ کتبوں اور سکوں کی روشنی میں لکھی گئی ہے جو اب تک منظر عام پر آنے والی کتابوں میں اہم ہے۔

---

[۱] عبدالمجید صدیقی ص۵۶۔

۷۔ بہمنی نامہ کے ایک شاعر کا تخلص ڈاکٹر صاحب سماعی بتاتے ہیں غالباً اصل تخلص سامعی ہے جیسا کہ استاذ محترم نذیر احمد صاحب کے انگریزی مقالہ[۱] میں اس کا املا (Sami'i) لکھا گیا ہے۔

۸۔ ڈاکٹر نور السعید صاحب معارف جولائی ۱۹۹۱ء ص۳۵ پر لکھتے ہیں "آذری کے بعد عیانی نے پانچویں بہمنی بادشاہ کی مہم جوئی کا اضافہ کر دیا ہے" جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اور جیسا کہ خود قابل مقالہ نگار نے لکھا ہے جو تاریخ عیانی "در فتح قلعہ ساغر" کے عنوان کے تحت معارف جولائی ۱۹۹۱ء ص۴۲ پر دیا گیا ہے اس سنہ کی مطابقت میں فتح نامہ کا ممدوح محمود شاہ ابن محمد شاہ ثالث ہی ہو سکتا ہے جو بہمنی سلطنت کا پانچواں نہیں بلکہ چودھواں حکمراں ہے۔ پانچویں حکمراں محمد شاہ ثانی یا بقول فرشتہ محمود شاہ کا دور حکومت ۱۳۹۷ء۔ ۱۳۷۸ء۔ مطابق ۷۹۹۔ ۷۸۰ھ تھا۔ دستور دینار کا اس وقت وجود ہی نہیں تھا اور نہ کتب تاریخ میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے اور نہ قاسم برید اس وقت تک پیدا ہوا تھا جنکا سنہ فتح نامہ محمود شاہی میں ذکر ہے۔ اسی طرح بیدر میں شاہ محب اللہ و شاہ حبیب اللہ کی آمد بھی نویں حکمراں یعنی احمد شاہ ولی کے دور میں ہوئی ہے۔

ساغراب بھی گلبرگہ کے قریب آباد ہے اور اس وقت اسے ساگمہ کہا جاتا ہے بعض قدیم تاریخوں میں اس کا نام سگر دیا گیا ہے اسی کا معرب یا مفرس صاغر یا ساغر بنا ہوگا۔

---

[۱] Sherwani H.K. & Joshi P.H History of medieval Deccan Vol. II P 86

زوال پذیر ہوتے ہوئے بھی محمود شاہ ۱۴۸۲-۱۵۱۰ یا ۱۵۱۸ کے دور میں بہمنیول کا بھرم بنا ہوا تھا۔ یہ عیش و عشرت، موسیقی و رقص و سرود کا دور تھا۔ عیانی نے بھی بادشاہ وقت کی شان و شوکت کا ذکر کیا ہے اور کچھ نصیحتیں بھی کی ہیں۔ اسی عیش و نشاط کے دور میں موسیقی پر فارسی زبان میں ایک کتاب توضیح الحان لکھی گئی اور اسے محمود شاہ کے نام معنون کیا گیا[لہ]۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لیے مذکورہ بالا امور کی وضاحت فرمانے میں دریغ نہ کریں گے اور نو دریافت شدہ تاریخی مخطوطہ کو جو ان کے خیال میں تاریخ فرشتہ کا تکملہ ہے مرتب اور شایع کر کے بہمنی دور کی تاریخ میں مستند اضافہ فرمائیں گے۔

لہ Sherwani H.K. & Joshi P.M. History of Medieval Deccan .1974- P. 109-110

ہندوستان عربوں کی نظر میں

ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق قدیم عرب مصنفین خصوصاً جغرافیہ نویسوں سیاحوں اور مورخین کی کتابوں، سفرناموں اور تاریخوں میں جو مواد پھیلا ہوا ہے اس کو پوری دیدہ ریزی کے ساتھ دو جلدوں میں جمع کر دیا گیا ہے اور اسی کے بالمقابل دوسرے کالم میں اسکا نہایت سلیس اور عام فہم اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ عربی زبان پر جن لوگوں کو دسترس نہیں ہے وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں، قدیم ہندوستان کے مذہبی، علمی اور تمدنی حالات فارسی تاریخوں میں بہت کم ملتے ہیں اس لحاظ سے یہ کتاب ہندوستان کے قدیم کلچرل حالات کا نہایت مستند ماخذ ہے جس سے تاریخ ہند کے مصنفین اور محققین کو بڑی مدد ملے گی۔

قیمت جلد اول ۲۵ روپیے

"مینیجر"

اردو شاعری میں تخلص کی روایت

از

ڈاکٹر انیس ادیب

فارسی شاعری اپنی شیریں بیانی نازک خیالی اور لطافت و حلاوت کے علاوہ عشقیہ جذبات کے اظہار کا اور حدیث دل کی خوبصورت ترجمانی کا بہترین لسانی وسیلہ ہے۔ اس خصوصیت کے سبب فارسی شاعری نے دنیا کی بیشتر زبانوں کو لطیف شاعری کا مزاج عطا کیا ہے۔ محبت کے جو گیت فارسی شعراء نے گائے ہیں وہ عدیم المثال ہیں۔ تصوف و معرفت اور پند و نصیحت کا جو بیش بہا خزانہ فارسی زبان و ادب میں پایا جاتا ہے وہ اس دلکشی اور فراوانی کے ساتھ کہیں اور نہیں ملتا۔

فارسی شاعری نے اس امتیازی خصوصیت کے علاوہ اصناف سخن میں بھی بہت سی اختراعات کی ہیں غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، واسوخت، مستزاد، قطعہ بند اور ترجیع بند وغیرہ اصناف سخن خالص فارسی شاعری کی دین ہے ان اختراعات کے ساتھ تخلص کی روایت بھی فارسی شاعری ہی سے مستخرج ہے۔ فارسی کے ماسوا دنیا کی دوسری زبانوں میں تخلص کی روایت نہیں ملتی۔

عربی زبان شعر و شاعری اور نغمہ و ترنم کے لحاظ سے یقیناً بہت مالدار ہے اور اس کی شاعری کو دنیا کی قدیم ترین شاعری تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس میں بھی تخلص کا

رواج نہیں ملتا بلکہ عرب شعرا اپنے نام کے ساتھ نسبی، خاندانی اور قبائلی نسبت لگانا پسند کرتے ہیں اور کبھی قصائد کی تشبیب میں اپنا نام یا نام کا کوئی جز شناخت کیلئے استعمال کرتے ہیں چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے وہ مشہور قصائد جنھیں سبعہ معلقات یا مذہبات یا سموط کہتے ہیں اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں آبِ زر سے وصلیوں پر لکھوا کر اظہار مقبولیت اور دائمی شہرت کے لیے خانۂ کعبہ پر آویزاں کر دیا گیا تھا چنانچہ ان میں سے بعض تو فتح مکہ کے دن تک وہاں لٹکے ہوئے تھے اور کچھ اس آگ کی نذر ہو گئے جو اسلام سے قبل خانۂ کعبہ میں لگی تھی [۱]

ان ساتوں قصائد کے موجد شعرا امرءالقیس، زہیر بن ابی سلمی، طرفہ بن العبد لبید بن ربیعہ، عنترہ بن شداد، عمرو بن کلثوم اور حارث بن حلزہ ہیں جن کے نام کے ساتھ کوئی تخلص نہیں ہے۔ تخلص کے بارے میں مشہور محقق مولانا اصغر علی روحی اپنی کتاب "دبیر عجم" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بداں کہ تخلص از اختراعات شعرائے عجم است اہل عرب بداں آشنا نبودہ اند بل ایشاں بالقب وکنیت شہرت می یافتند" [۲]

ایسی صورت میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تخلص ایران کی ایجاد ہے اور اس کی نظیر دنیا کے کسی اور ادب میں موجود نہیں ہے۔

انگریزی زبان کی شاعری بھی تخلص کی اس خوبصورت ادبی روایت سے خالی ہے ان کے یہاں کہیں قلمی Nom de plume اور کہیں شخصی شناخت کے لیے اشاراتی الفاظ نظر آتے ہیں لیکن فارسی شاعری کی طرح باقاعدہ تخلص نہیں ملتا۔

ہندی شاعری بھی تخلص سے خالی ہے ویر گاتھا کال کے مشہور شاعر چند بردائی

کی اہم ترین تصنیف "پرتھوی راج راسو" [۳] میں اس کا کوئی تخلص نہیں ہے۔ بھگتی کال کے مشہور شعرا کبیر داس، تلسی داس اور سور داس بھی تخلص نہیں رکھتے تھے ریتی کال کے مشاہیر شعرا عبدالرحیم خان خاناں، کیشو داس، گنگ کوی، بہاری لال چوبے اور متی رام کا نام خاص طور پر مشہور ہے ان میں عبدالرحیم خان خاناں کے علاوہ سبھی تخلص سے عاری ہیں۔ عبدالرحیم خان خاناں چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی کے بھی شاعر تھے اور فارسی میں رحیم تخلص کرتے تھے۔ اس کی رعایت سے ہندی شاعری میں بھی کہیں رحیم اور کہیں رحیمن تخلص اختیار کیا ہے۔

عصر حاضر میں ہندی کے کچھ شعرا فارسی اور اردو سے متاثر ہو کر تخلص اختیار کرنے لگے ہیں جیسے بال کرشن شرما کا تخلص نوین ہے، ہری ونش رائے کا تخلص بچن ہے اور رام دھاری سنگھ کا تخلص دنکر ہے جب کہ ان کے ہم عصر دیگر شعرا پنڈت ماکھن لال چترویدی، سیارام شرن گپت، سبھدرا کماری چوہان تخلص نہیں رکھتے۔

فارسی کا پہلا بڑا شاعر جو اپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہوا ابو عبداللہ جعفر بن محمد المتخلص بہ رودکی تھا اس کے بعد فارسی کے چھوٹے بڑے تمام شعرا نے اپنے نام کے ساتھ تخلص اختیار کیا ہے، چند مشاہیر کے نام ملاحظہ ہوں۔ شیخ شرف الدین سعدی۔ خواجہ شمس الدین حافظ۔ ابوالقاسم فردوسی۔ محمد عمر خیام۔ اوحدالدین انوری۔ افضل الدین خاقانی۔ فخرالدین عراقی۔ جمال الدین عرفی۔ محمد حسین نظیری۔ میرزا حبیب قاآنی وغیرہ۔

تخلص کے معنی | تخلص کے لغوی معنی رہائی پانا ہے۔ شعرا کی اصطلاح میں گریز کا لفظ معروف ہے یعنی تشبیب سے مدح کی طرف نکلنا اور بعد میں ممدوح کے نام کا

گریز میں لانا۔ تخلص کا لفظ قدیم تصانیف میں اگر یہ گریز ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جسے تخلص بھی کہتے ہیں۔ غزل کے آخر میں تخلص لانے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ عموماً تشبیب کے آخر میں تخلص یا شاعرانہ نام لایا جاتا تھا اس لیے جب غزل الگ صنف قرار پائی تو تخلص کی رسم اپنے ساتھ لائی، مقطع میں تخلص کا التزام اسی پرانی رسم کی یادگار ہے۔

تخلص کی ضرورت

غالب گمان یہ ہے کہ سب سے پہلے شاہی درباروں میں جہاں ایک ہی ممدوح کی مدح کہنے والے کئی شعرا ہوتے تھے اس لیے کلام کو اختلاط اور سرقہ سے بچانے کے لیے انھوں نے اپنے نام یا نسبت یا کنیت کو امتیاز کی خاطر اپنے کلام میں داخل کرنے کا اہتمام کیا ہوگا۔

تخلص کا انتخاب اور موزونیت

تخلص کے انتخاب میں اصل نام سے زیادہ احتیاط برتنی پڑتی ہے کیونکہ ہر تخلص کی کوئی نہ کوئی مناسبت اور رعایت ہوتی ہے بیشتر تخلص ایسے ہوتے ہیں جن سے شاعر کی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔ ایسے تخلص بھی رکھے جاتے ہیں جو شاعر کے رنگ شاعری کے آئینہ دار ہوتے ہیں تخلص کی موزونیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے تاکہ مروجہ بحور عروضی میں آسانی اور روانی کے ساتھ استعمال ہو سکے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب، زبانیں اور ذات برادریاں ہیں اور جہاں مختلف رنگ و نسل کے اصنام کی کثرت ہے اس کثرت میں تخلص یقیناً وحدت کا ایک مضبوط رشتہ ہے جو تمام رنگوں کو ایک دھارے میں سمو کر خالص ادبی اور بے تعصبی کا ماحول پیدا کر دیتا ہے اس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی کا کوئی امتیاز باقی

نہیں رہتا بلکہ سب ایک ہو کر ادبی اور روحانی سماج کے فرد بن جاتے ہیں، اس طرح تخلص گویا قومی یکجہتی کا ایک بہترین وسیلہ ہے اس میں رگھوپتی سہائے، پنڈت تلوک چند، لبھورام، بال مکند، نریش کمار، اسد اللہ خاں، مرزا محمد رفیع، فضل الحسن، علی سکندر، سب اپنا مذہب و مسلک ذات برادری اور گوت خاندان کا خول اتار کر صرف ایک صاحب فن، ایک انسان اور ایک شاعر کی صورت میں جلوہ گر ہو کر فراق، محروم، جوش، عرش، شاد، غالب، سودا، حسرت اور جگر بن کر شعر و ادب، سماج اور انسانیت کے خادم اور ترجمان ہو جاتے ہیں۔ یہ فارسی شاعری کے تخلص کا ایک اعجاز ہے اور اس تخلص کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ وطنی اور علاقائی نسبت لگا کر حب الوطنی کا پاک اور پُر خلوص جذبہ بھی پیدا کر دیتا ہے، اردو کے بہت کم شعرا تخلص سے بے نیاز رہے ہیں کچھ شعرا نے اپنے نام ہی کو تخلص بنایا ہے جیسے اکبر الہ آبادی۔ فیض احمد فیض اور شیخ محمد اقبال وغیرہ، اردو کے ہزاروں شاعروں میں چند ایسے شعرا بھی مل جائیں گے جنھوں نے اپنے نام کو بھی تخلص نہیں بنایا اور الگ سے بھی کوئی تخلص اختیار نہیں کیا مثلاً عظمت اللہ خاں اور خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ۔

حواشی

[۱] تاریخ ادب عربی زیات ترجمہ طفیل احمد مدنی ایوان کمپنی الہ آباد ۱۹۷۹ء ص ۳۳ [۲] مباحث حصہ اول ڈاکٹر سید عبداللہ کتب خانہ نذیریہ دہلی ۱۹۶۸ء ص ۴۰،۴۱ [۳] ہندی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محمد حسن انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۵ء ص ۳۶۔

مولانا فراہیؒ سیمینار

از ضیاء الدین اصلاحی

۸، ۹، ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ میں اسکے طلبائے قدیم کی انجمن کی طرف سے ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ پر ایک سہ روزہ سیمینار ہوا، مولانا کی زندگی قرآن مجید کی خدمت اور اس میں غور و فکر میں بسر ہوئی اور وہ اس عہد میں قرآنیات کے متبحر عالم تھے، انھوں نے تفسیر اور قرآن فہمی کے بعض نئے اصول دریافت کیے جن میں سب سے مہتم بالشان نظمِ قرآن ہے۔

مولانا فراہیؒ جس پایہ کے عالم تھے اس سے بڑھ کر صاحب زہد و ورع تھے، وہ نام و نمود اور شہرت سے ہمیشہ متنفر اور اپنی تصنیفات کی طبع و اشاعت سے بے پروا رہے اس لیے دنیا ان کی قدر و منزلت کو پہچان نہ سکی اور ان کے فضل و کمال سے ناآشنا رہی، اب گو ان کے تلامذہ و منتسبین کی کوششوں سے ان کے متعدد تفسیری رسائل اور قرآنی تصنیفات شایع ہوگئی ہیں لیکن پھر بھی بہت کچھ غیر مطبوع ہے۔

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر دراصل مولانا حمید الدین فراہیؒ کی معنوی یادگار ہے، اس لیے اس کے قدیم طلبہ نے مولانا کی شخصیت، کمالات، علمی و دینی خدمات اور تفسیری کارناموں سے روشناس کرانے کے لیے ایک سیمینار کرنے کا فیصلہ کیا۔

جس کی ذمہ داری مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم کو سپرد کی گئی تھی اور انھوں نے اس کے لیے تگ و دو بھی شروع کر دی تھی مگر ان کا وقتِ آخر آگیا، اس کے بعد مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سابق امیر جماعت اسلامی ہند کی سرپرستی و سرگرمی میں اس مہم نے شدت اختیار کی مگر گذشتہ سال ملک کے غیر یقینی حالات کی بنا پر سیمینار کو ملتوی کرنا پڑا اس درمیان میں مولانا ابواللیث صاحب بھی سفرِ آخرت کے لیے روانہ ہوگئے۔

بالآخر اس سال سیمینار ہوا جو الحمد للہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، اسکے افتتاح کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کو دعوت دی گئی تھی جس کو انھوں نے بخوشی منظور کرلیا۔ اگرچہ وہ بیرونی ملکوں کے ایک طویل سفر سے واپس آئے تھے مگر انھوں نے فرمایا کہ جس ذات گرامی کی نسبت سے سیمینار ہو رہا ہے اس کی بنا پر اس میں شرکت ضروری تھی، انھوں نے مولانا فراہیؒ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی تصانیف کو جو عربی میں ہیں اہتمام سے شایع کر کے عربوں تک پہنچانے کی جانب توجہ دلائی اور مولانا کے منتسبین کو انہی کی طرح قرآن میں مسلسل غور و فکر کرتے رہنے اور اس کے نئے نئے پہلوؤں اور گوشوں کی تلاش و جستجو میں لگے رہنے کی دعوت دی کیونکہ قرآن مجید کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔

مولانا کے ہمراہ مولانا محمد رابع ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا محبوب الرحمٰن ازہری اور ندوۃ العلماء کے بعض نوجوان اساتذہ بھی تشریف لائے تھے۔

دار المصنفین کی بنا و تاسیس میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نمایاں اور خاص حصہ تھا اور وہ اپنی زندگی کے آخر تک اس کی مجلس عاملہ کے صدر نشیں رہے اس لیے دار المصنفین کے تمام رفقا اور اہل تعلق بھی سیمینار میں موجود رہے، راقم الحروف کا تعلق دونوں اداروں سے ہے اس لیے اس کی ذمہ داری دہری تھی۔

افتتاحی جلسہ کی صدارت مولانا فراہیؒ کے خاص شاگرد مولانا نجم الدین اصلاحی نے کی اور ڈاکٹر اشتیاق ظلی اصلاحی نے پُر مغز خطبۂ استقبالیہ پڑھا جو بہت پسند کیا گیا، وہی اس سہ روزہ سیمینار کی نظامت بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، اودھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ ہمدرد دہلی، جواہر لال یونیورسٹی دہلی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد، ادارۂ تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، شبلی کالج اعظم گڈھ کے اصحاب علم نے مقالات پڑھے، پاکستان سے بھی بعض اہل علم تشریف لائے تھے اور انھوں نے بھی مقالے پیش کیے، کئی مقالات وقت کی تنگی کی وجہ سے پڑھے نہیں جاسکے، قرب وجوار کے مدارس عربیہ کے اساتذہ و طلبہ بھی سیمینار کی کارروائی میں شریک ہوئے۔

مقالات میں مولانا فراہیؒ کے تفسیری اصول و اولیات، علوم قرآنی، فلسفہ، ادب و بلاغت اور فارسی و عربی شاعری میں انکے امتیازات و کمالات زیر بحث آئے، مقالات کے پانچ جلسے ہوئے ان میں مقالات پر سوالات اور کافی بحث بھی ہوئی، اس سیمینار کی بڑی خصوصیت یہی تھی کہ مدرسۃ الاصلاح کے پلیٹ فارم سے مولانا فراہیؒ کے خلاف بھی بعض مضامین پڑھے گئے اور مقالات کے دوران میں اسی نوعیت کے سوالات بھی کیے گئے، گو اس طرح کے اکثر مقالے اور سوالات عدم واقفیت اور مولانا فراہیؒ کی تحریروں کی قلت مطالعہ کا نتیجہ تھے تاہم مولانا کے متوسلین نے ان کو ضبط و تحمل سے سنا اور ان کے مناسب جواب دیے، اس علمی فراخ دلی اور معروضیت کی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

سیمینار کی خوش انتظامی اور نظم و ضبط کی پابندی بھی قابل تعریف تھی ہر پروگرام وقت سے شروع ہوا۔ مدرسۃ الاصلاح ایک دیہات میں واقع ہے اور وہ ریل لائن سے دور بھی ہے، اسکے باوجود اہل علم اور اصحاب دانش کے اتنے بڑے مجمع کی وجہ سے اس ویرانہ میں بہار آگئی تھی جو مولانا فراہیؒ کے افکار کی معنویت کا بڑا ثبوت ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں، اساتذہ اور بالخصوص طلبہ نے شب و روز ایک کرکے بڑی مستعدی و جانفشانی اور نہایت شوق و دلچسپی سے مہمانوں کی پذیرائی کی اور کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا، انھوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مندوبین و مدعوئین کے آرام و آسایش کا پورا خیال رکھا، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ مولانا فراہیؒ کے سب سے مایۂ ناز شاگرد ہیں، مدرسۃ الاصلاح کے در و دیوار ہی نہیں پورا خطۂ اعظم گڈھ انکے استقبال کے لیے بے چین تھا مگر وہ اپنی کبرسنی، معذوری اور علالت کے سبب تشریف نہیں لاسکے، ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی گئی انکے رفیق خاص جناب سلطان احمد صاحب کراچی نے ان کا سلام و پیام سب کو پہنچایا، مگر اس سے کہاں مشتاق لوگوں کو تسکین ہوتی، ان کے شاگرد خاص جناب خالد مسعود صاحب آنے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن عین وقت پر ویزا نہیں ملا، انکے دو مقالے پہلے ہی آچکے تھے مگر خود ان کی کمی بھی محسوس کی گئی۔

آئندہ بھی اس قسم کے مذاکرہ کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے تاکہ مولانا فراہیؒ کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان کے افکار و خیالات کی مزید اشاعت ہو۔

اخبارِ علمیہ

ترکی کے ادارہ ' IRCICA ' کے سہ ماہی خبر نامہ سے معلوم ہوا کہ اس سال کے اوائل میں استنبول میں عکسی تصویروں کی ایک تاریخی نمائش کا اہتمام کیا گیا، انیسویں صدی میں اور خصوصاً اس کے نصف آخر میں مشرق وسطیٰ کو فوٹوگرافی کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت دی گئی، ۱۸۵۰ء سے محققین سیاحوں کی صورت میں مغرب سے آنے والوں کا ایک لامتناہی سلسلہ یہاں شروع ہوا، ان میں سے بعض کی سیاحت کے نقوش کیمرہ نے محفوظ کر لیے، فوٹوگرافی کے قدیم خصوصی ماہرین مثلاً میکزیم ڈو کیمپ، آغسٹ سالزمان اور ولہم وان ہرفورڈ کی بعض تصویروں کو فوٹوگرافی کے اولین اور بنیادی نمونوں کی حیثیت حاصل ہے، مصر فلسطین اور مملکت عثمانیہ سے متعلق ان کی اور دوسرے فنکاروں کی تقریباً ۱۲۹ تصویروں کو اس نمائش میں پیش کیا گیا، استنبول کے ۱۲ مرقعے بھی تھے جو ۱۰۔۱ میٹر وسیع و عریض تھے، نمائش کے اختتام پر استنبول کے اورینٹ انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر وولف دیتیر لیمبک نے 'انیسویں صدی میں مشرق اقصیٰ میں فوٹوگرافی' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا۔ اس موقع پر نمائش کا اہتمام کرنے والے ادارہ اگفا ہسٹورا مانے دلکش اور نفیس ترین تصویروں کا البم 'ایشیا کے خوبصورت سواحل پر' کے عنوان سے شایع کیا، اس میں فوٹوگرافی کی تاریخ

اور جرمن ترکی تعلقات ۱۸۴۰ء-۸۰ کے عنوان سے دو اہم مضمون بھی شامل ہیں، البم میں ہر نادر تصویر کے متعلق معلومات کے علاوہ انیسویں صدی کی فوٹوگرافی کی تکنیک پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے

یورپ میں عربی اور اسلامی تہذیب و تمدن کے مطالعہ کو جو خاص اہمیت حاصل ہے اس کا ایک مظہر یورپین یونین آف عربسٹ اینڈ اسلامولوجسٹ (U.E.A.i) ہے، یہ نہایت اعلیٰ معیار کی انجمن ہے، اس کی مجلس ارکان میں بلجیم، بلغاریہ، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، ناروے، پرتگال، اسپین، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ترکی اور برطانیہ کے ممتاز اہل علم شامل ہیں، ۱۹۸۴ء میں اسپین کے شہر ملاگا میں اس یونین کا جلسہ مسلم ہسپانیہ کی تاریخ و تہذیب اور اس کے فلسفہ و سائنس، ادب، علمی اداروں، یورپ اور شمالی افریقہ سے تہذیبی تبادلہ اور دوسرے مسائل پر ہوا تھا، ان موضوعات پر تقریباً ۴۳ مقالات پیش کیے گئے تھے، اب معلوم ہوا کہ اسپینی زبان میں ان تمام مقالات کو ACTAS DEL XII CONGRESO DE LA U.E.A.i کے نام سے شایع کر دیا گیا ہے۔ جس کو ہسپانیہ کی تاریخ اسلام کے متعلق ایک نہایت کارآمد اور مفید ذخیرہ بتایا گیا ہے۔

اسلامی علوم کی خدمت کا ایک مرکز پیرس بھی ہے، جہاں حال ہی میں فرانسیسی زبان میں مصر کے مشہور محقق اور ممتاز اہل قلم عبدالرحمٰن بدوی کی نئی کتاب

DEFENSE DU CORAN CONTRE SES CRITIQUES

شایع ہوئی ہے، مشرق و مغرب میں اسلام کے نقادوں اور نکتہ چینیوں کا پہلا نشانہ قرآن مجید ہی ہوتا ہے، صدیوں سے چند اعتراضات مختلف آہنگ و انداز سے دہرائے جاتے رہے ہیں، مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اسلام کے خلاف تحریری حملے دوسری صدی ہجری سے ہی شروع ہو گئے تھے اور قرآن مجید کے خلاف سترہویں صدی کے اواخر سے تحریریں شایع ہونے لگیں، مصنف نے اس کتاب میں انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط تک کی ۲۰ اہم کتابوں کے مشمولات کو موضوع بحث بنایا ہے اور بڑی خوبی سے اعتراضات کا رد و ابطال کیا ہے۔

امریکا میں اسلام کے پیام کو عام کرنے والے متعدد افراد و اداروں میں دی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (T iii) اور دی ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹ (AMSS) ممتاز و نمایاں ہیں، ان کی بعض خدمات کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، ان دونوں تنظیموں کی جانب سے ایک علمی مجلہ دی امریکن جنرل آف اسلامک سوشل سائنس' کے نام سے گذشتہ آٹھ برسوں سے شایع ہو رہا ہے، اس قلیل مدت میں اپنے پُر مغز، سنجیدہ اور باوقار مضامین کی وجہ سے امریکا و بیرون امریکا کے علمی حلقوں میں اسے قدر کی نظر سے دیکھا گیا، گذشتہ دنوں ہمیں اس رسالہ کے گذشتہ سات برسوں کے مضامین کی ایک فہرست اور اشاریے موصول ہوئے جو بڑے سلیقہ سے مرتب کیے گئے ہیں، فہرست سے مجلہ کی علمی خدمات کا

پورا اندازہ ہوتا ہے اس کی مجلس ادارت اور مدیر مسئول سید، ایم سعید اس کے لیے قابل مبارکباد ہیں، مجلہ کا پتہ یہ ہے:

AJISS. SUBSCRIPTION DEPARTMENT

P.BOX: 669 HERNDON-VA. 22070 (USA)

امریکا اور یورپ میں حکم اذاں کی تعمیل جس درجہ میں بھی ہے، مستحسن ہے، روس و مشرقی یورپ میں کمیونزم کی آہنی دیوار کے مسمار ہونے کے بعد ایک طرف تو اہل سیاست، ماہرین معاشیات اور حوصلہ مند تاجر مستقبل کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے بے قرار ہیں، دوسری جانب روحانیت' سکون قلب اور مقصد تخلیق آدم کی معرفت سے عاری اور خالی معاشرہ کے لیے ارباب کلیسا بھی فکر مند ہیں، چنانچہ ایک نہایت ممتاز مذہبی رہنما نے کہا کہ یورپ ایسا بر اعظم ہے جو تشخص، معنی اور مقصد کی تلاش میں ہے، بیشتر یورپ کو باطن کے خلا اور کھوکھلے پن اور روحانی قوت و توانائی کے گم ہونے کا احساس ہے، بعض اور مذہبی رہنماؤں نے اعتراف کیا کہ گو مغربی یورپ کی سرمایہ داری نے کامیابی کے ساتھ مادی ضروریات کو فراہم کیا ہے تاہم باطن کا بحران قائم ہے اور بتدریج انتشار، الجھن اور اضطراب کی جانب گامزن ہے۔ موجودہ یورپی معاشرہ میں اقدار کی تلاش بے سود ہے، ماحول میں بے یقینی و بدعقیدگی ہے، اب معاشرہ اپنے ہیروؤں سے خالی ہو گیا ہے، آیندہ زندگی کا نہ تصور ہے نہ خیال، ان حالات میں چرچ یا مذہب کی ضرورت

اور بڑھ گئی ہے، لیکن بعض پادریوں اور قسیسوں کے سخت لب ولہجہ نے سیاستدانوں اور صحافیوں کے ایک حلقہ کو ناراض کر دیا ہے، ان لوگوں کا خیال ہے کہ چرچ میں تکبر آگیا ہے اور اسے کلیسا کے بے ضرر ماحول ہی میں رہنا چاہیے۔

۱۹۳۰ء میں برنارڈ شا نے کہا تھا کہ برطانی اور امریکی قوموں کو ایک ہی زبان کے ذریعہ تقسیم کر دیا گیا، لیکن انگریزی زبان کے ماہرین کا خیال ہے کہ آج انگریزی زبان اگر بین الاقوامی اہمیت کی حامل ہے اور سائنس، سیاست، کمپیوٹر اور عالمی جلسے جلوسوں میں اس کا استعمال ناگزیر ہے تو اس کا سہرا امریکا کے سر ہے، اور کسی زمانہ کی غریب الدیار اور جلاوطن امریکی انگریزی کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اب ایک عالمی درجہ کا مرکز مطالعات امریکا قائم کیا جارہا ہے، یونیورسٹی کے نشریہ میں اسے امریکی تاریخ وسیاست اور حکومت وغیرہ کے مطالعہ کا بیرون امریکا سب سے بڑا مرکز قرار دیا گیا ہے لیکن بعض لوگ اسے آکسفورڈ پر امریکی غلبہ و فتح سے تعبیر کر رہے ہیں، آکسفورڈ اور کیمبرج میں غالباً اقتصادی پریشانی کی وجہ سے اس قسم کے سنٹر قائم کیے جا رہے ہیں، پرائیویٹ فنڈ کا حصول خاص مقصد ہے، چنانچہ مطالعات جاپان کے لیے مشہور جاپانی تجارتی ادارہ نسان اور چینی علوم کے مطالعہ کے لیے ہانگ کانگ کے ایک سرمایہ دار سمرلن رن شا کے دس ملین پونڈ کی امداد سے قائم ہونے والے مراکز کا شمار اسی فہرست میں ہے۔

(ع۔ص۔)

معارف کی ڈاک

پروفیسر مختار الدین احمد کا مکتوب گرامی

علی گڑھ

یکم اکتوبر ۱۹۹۱ء

مکرمی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب السلام علیکم

معارف ستمبر ۱۹۹۱ء میں وہ مضمون دیکھا جس میں میری دو تحریروں کی دو غلطیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

(۱) پہلی یہ کہ اسامہ بن منقذ کی نئی دریافت شدہ کتاب "تاریخ البدری" نہیں۔ "اخبار النساء" ہے۔ بھائی میں تو ۸ ماہ پہلے معارف ہی میں اس کی تصحیح کر چکا ہوں۔ تصحیح شایع کرنے کا کیا فائدہ اگر مضمون نگار اسے نہ پڑھیں اور آپ بھی اس کا خیال نہ رکھیں[1]۔

(۲) دوسری یہ کہ مدیر معارف کے نام ایک ممتاز مصنف نے اپنے مکتوب میں "لباب الآداب" کو عربی کے "نثری ادب کا انتخاب" بتایا تھا، میں نے لکھا تھا کہ یہ عربی نظم کا انتخاب ہے۔ مضمون نگار نے صحیح لکھا ہے کہ یہ نظم ونثر دونوں کے منتخب نمونوں پر

[1] **معارف** مذکورہ تصحیح ایک مضمون کے نیچے شایع ہوئی تھی، ممکن ہے اس پر مضمون نگار کی نظر نہ پڑی ہو لیکن راقم کی غلطی کے لیے نہ کوئی وجہ جواز ہے نہ عذر، بجز اس کے کہ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا، فاضل مکتوب نگار اگر اپنے دامنِ عفو میں جگہ دیدیں تو یہ انکی عالی ظرفی اور بندہ نوازی ہوگی۔ پروفیسر نذیر احمد نے بھی اس غلطی کی طرف توجہ دلائی جس کے لیے ان کا بھی ممنون ہوں

مشتمل ہے۔ یہ کتاب جو چالیس سال پہلے طالب علمی کے زمانے میں دیکھی تھی استاذ مرحوم علامہ عبدالعزیز المیمنی کی تھی اور انکے ساتھ کراچی چلی گئی، پھر اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

مولانا غلام محمد صاحب، کراچی (خدا انہیں شفائے عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے) کا مکتوب گرامی ابھی شمارے میں نظر سے گزرا، اس سلسلے میں گزارش ہے کہ گجرات کے عربی مصنفین و شعراء پر سید باقر علی ترمذی مرحوم نے تحقیقی مقالہ لکھکر بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ لی ہے۔ میرے استفسار پر جناب ضیاء الدین ڈیسائی (۱۴ خورشید پارک، احمد آباد - ۳۸۰۰۵۵) نے مجھے اطلاع دی تھی کہ مقالہ انکی ناگہانی وفات کیوجہ سے شایع نہ ہوسکا، لیکن اس کا ایک نسخہ بمبئی یونیورسٹی میں محفوظ ہوگا۔ ڈیسائی صاحب سے مزید معلومات حاصل کیے جاسکتے ہیں، جناب یوسف متالہ (انگلستان) کو اگر موضوع سے دلچسپی ہے تو بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو خط لکھ کر مقالے کی زیروکس کاپی منگوا سکتے ہیں۔

آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ لاہور کی آخری دونوں جلدیں یعنی ۲۲ ویں (صفحات ۶۰۸، تعداد مقالات ۳۴۸ تقریباً) اور ۲۳ ویں (صفحات ۳۰۳، مقالات ۳۲۰ تقریباً) چھپ کر اس ہفتہ میرے پاس آگئیں۔ اب استدراکات و تصحیحات اور اشاریے کی جلدیں مرتب ہورہی ہیں مستشرقین اور دوسرے علماء کے مقالات پر ارکان ادارہ نے مفید اضافات کیے ہیں اور قیمتی تعلیقات لکھے ہیں، کہیں کہیں طویل مقالات کی ایسی مفید تلخیص کردی ہے کہ سارے ضروری مطالب آگئے ہیں۔ نئے مقالات بھی لکھوائے گئے ہیں جو زیادہ تر پاکستانی فضلاء کے قلم کے مرہون منت ہیں۔ ان مجلدات کی اشاعت پر رئیس ادارہ پروفیسر سید امجد الطاف اور انکے رفقاء کار مرزا مقبول بیگ بدخشانی، شیخ نذیر حسین اور حافظ محمود الحسن عارف کو جس قدر مبارکباد دی جائے کم ہے۔

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مختار الدین احمد

وفیات

آہ! مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی

از ضیاء الدین اصلاحی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ میں رشد و ہدایت اور اصلاح و ارشاد کی وہ شمع فروزاں بجھ گئی جس کو حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی نے روشن کیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد احمد پرتابگڈھی اپنے ہزاروں مسترشدین اور عقیدتمندوں کو سوگوار اور اشکبار چھوڑ کر رفیق اعلیٰ سے جاملے رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

وہ اس دور کے شیخ کامل، عارف باللہ اور "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کا مصداق تھے۔

راقم الحروف کو چند بار حضرت کی خدمت میں حاضری اور انکے اشغال و معمولات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا انکی زندگی زہد و ورع اور سادگی و اخلاص میں سلف صالحین کا نمونہ اور خلق نبویؐ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ان کو سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں نسبت حاصل تھی اور وہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کے مسترشد مولانا شاہ بدر علی صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ تھے اس لیے وہ ہمیشہ طریقت پر شریعت کو مقدم رکھتے تھے اور اتباع سنت انکا شعار تھا۔ تواضع و انکسار انکی سرشت میں داخل تھا، کہیں سے اپنی برتری اور کمال کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، ہر شخص سے لطف و محبت کا برتاؤ کرتے، انکی شفقت و دلجوئی، اخلاص و بےنفسی سادگی و بے تکلفی، خورد نوازی اور مظاہر سے بے پروائی کیوجہ سے لوگ خود ان کے گرویدہ ہوجاتے تھے، جن لوگوں کو خانقاہی نظام کے رسوم و آداب سے واقفیت اور مناسبت

نہیں ہوتی تھی وہ بھی انکی دلنوازی و بے تکلفی کیوجہ سے ان سے مانوس ہو جاتے تھے، راقم الحروف سے وہ بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اس لیے مجھے بھی ان سے بڑی انسیت ہو گئی تھی، میرے ایک بزرگ مولانا محمد عاصم اصلاحی مرحوم کے روابط ان سے بڑے مخلصانہ تھے اور وہ برابر اپنی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں تشریف لے جاتے تھے اور جب واپس آتے تو حضرت کا سلام و پیام مجھ کو پہنچا کر محجوب کرتے۔

ان کی مجلس میں نہ کسی کی غیبت و دلآزاری ہوتی اور نہ کسی پر تنقید، وہ صرف توحید و اخلاص کا درس دیتے، سنت کے اتباع اور بدعت سے اجتناب کی تلقین فرماتے اور اہل اللہ کا تذکرہ کرکے لوگوں کے ایمان و یقین میں اضافہ فرماتے۔

انہیں نام و نمود اور شہرت و جاہ سے نفرت تھی، اگر وہ بھی عام مشائخ اور ارباب طریقت کا انداز اختیار کرتے تو پورے ملک میں انکا غلغلہ بج سکتا تھا لیکن انکے درویشانہ مزاج نے انہیں گوشۂ گمنامی سے باہر نہ آنے دیا اسکے باوجود سالکین و طالبین کا رجوع انکی ذات کی جانب بہت بڑھ گیا تھا اور خصوصیت سے مشرقی اترپردیش کے لوگوں کو ان سے بڑا فیض پہنچا۔

مولانا شریعت و طریقت کے جامع تھے، انکی دکان معرفت سے دردمندوں کی دوائے دل ہر وقت ملتی تھی، نفوس کی اصلاح و تزکیہ اور مسترشدین کی ہدایت و تربیت ہی انکا اصل شغلہ تھا، پیشہ ورانہ تقریر و تحریر کی نہ انکو فرصت تھی اور نہ ان سے مناسبت تھی، اپنے حلقہ بگوشوں کے سامنے جو وعظ و ارشاد فرماتے وہ نہایت دل پذیر اور موثر ہوتا بعض حضرات نے اس کو مرتب کرکے "روح البیان" کے نام سے دو حصوں میں شایع کیا تھا، اس میں رضائے الٰہی کے حصول، آخرت کے استحضار، کتاب و سنت کے اتباع، ذکر، تلاوت و عبادت کی فضیلت، اخلاق و معاملات کی صفائی، تزکیۂ قلب، اخلاص نیت، اصلاح عمل اور اہل اللہ سے محبت

و تعلق وغیرہ کی تاکید کی گئی ہے۔

مولانا کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور اسکا عمدہ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے انکی محفل ارشاد و ہدایت انکے پُرسوز اور عشق و مستی سے معمور کلام کیوجہ سے ہمیشہ نہایت پُراثر اور پُرکیف ہوتی تھی، انکا مجموعۂ کلام "عرفان محبت" کے نام سے شایع ہوا ہے یہ اسم بامسمٰی اور سلوک و معرفت کا لائحہ عمل ہے مولانا کے نزدیک راہ سلوک کی سب سے بڑی دولت محبت ہے، اسی کو وہ اپنے مسترشدین میں لٹانا چاہتے تھے کیونکہ اس سے تمام اسرار و حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، اسی لیے وہ خود بھی آتش عشق و محبت میں مرکر جینا اور بسمل کیطرح تڑپنا پسند کرتے تھے انکا یہ مجموعہ عشق و محبت اور جوش و مستی کے انہی حقائق و اسرار کی کیفیتوں اور لذتوں کی شرح و تعبیر اور لاہوتی ترانوں اور سرمدی نغموں سے معمور ہے، مولانا کا کلام زلف و گیسو، رخ و عارض اور گل و بلبل کی حکایات اور ہجر و وصال کی داستان کے بجائے انکے قلبی واردات اور باطنی کیفیات کا آئینہ دار ہے اور یہ عشق کی مستی و سرشاری، محبت کی گرمی و شعلہ نوائی، جذبات کی لطافت و پاکیزگی اور خیالات کی معنویت و بلندی کا حامل اور بادۂ معرفت کا چھلکتا ہوا جام ہے۔

مولانا کا اصلی کمال یہ ہے کہ عشق و مستی اور جذب و کیف کے عالم میں بھی انکا ہوش و حواس بجا رہتا ہے، اور وہ بندگی کی لذت کے مقابلہ میں حال و قال کی لذتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں، مولانا کا کلام صوفیانہ و عاشقانہ شاعری میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور یہ سلوک و تصوف کا ایک صحیفہ ہے۔

ان کا دل دینی حمیت اور اسلام کی محبت و حمایت کے جذبہ سے سرشار تھا یہ بھی انکی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے وہ مسلمانوں کیطرح دنیا کے بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کا ولولہ بھی رکھتے تھے، ایک موقع پر مسلمانوں کو معمار جہاں بن جانے کی اس طرح تلقین فرماتے ہیں ؎

رحمت کا ابر بن کے جہاں بھر میں چھائیے ۔ عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے

کاش مسلمان اپنا یہ فراموش شدہ سبق یاد کرلیں۔

باب التقریظ والانتقاد

احسن البیان فی علوم القرآن

از

ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب

ڈاکٹر حسن الدین احمد ایک کامیاب عہدہ دار ہونے کے باوجود علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا بھی عمدہ ذوق رکھتے ہیں جو انہیں ورثہ میں ملا ہے اور انھوں نے اپنے دادا شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا کی یادگار میں ایک ولا اکاڈمی قائم کی ہے، اس کی جانب سے متعدد علمی کتابیں، شعری مجموعے اور اہم کتابوں کے ترجمے شایع ہوئے ہیں، وہ "ڈاکٹر سید عبداللطیف قرآنی ٹرسٹ" کے بھی صدر ہیں اور خود انکے قلم سے کئی اچھی کتابیں نکلی ہیں، "اردو و الفاظ شماری" انکی ضخیم تحقیقی کتاب ہے یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، "ساز مغرب" دس جلدوں میں ہے، اس میں ایک ہزار مقبول عام انگریزی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ دیا گیا ہے جو اس برصغیر کے مختلف شعرا نے کیا ہے، اسی تحقیقی کام پر موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے، ڈاکٹر صاحب کی تصنیف "قرآنی الفاظ شماری" بھی دو جلدوں میں ہے اور اس کا انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ترجمہ شایع ہوا ہے، "نغمہ الوہیت" کے نام سے بھگوت گیتا کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے، "انجمن" اور "محفل" میں بہت سے ہم عصر مشاہیر قوم کا تذکرہ ہے۔

احسن البیان فی علوم القرآن ڈاکٹر حسن الدین احمد کی نئی تحقیقی کتاب ہے، اس میں قرآن مجید کے علوم کا احاطہ کیا گیا ہے جو اس موضوع پر شایع ہونے والی اب تک کی کتابوں میں زیادہ جامع ہے۔

درحقیقت مسلمان جب تک قرآن مجید کا مطالعہ دقت نظر اور تحقیق سے کرتے رہے اس وقت تک ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہے آج بھی مسلمان قرآن مجید کی آیتوں کو سمجھ کر پڑھیں تو قرآنی اعجاز سے پھر سے ان کی حالت سدھر جائے گی۔ اخلاقی اور روحانی اقدار کی سربلندی ہوگی اور ہماری یہ زمین نور الٰہی سے جگمگا اٹھے گی (وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا) مسلمان ہمہ جہتی ترقی کریں گے اور ایک خوشحال معاشرہ کی داغ بیل ہوگی۔ لایق مصنف نے یہ قرآنی خدمت اسی لیے انجام دی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ کتاب کی بعض خامیوں کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے تاکہ جدید اڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ مرحوم نے اپنی لاجواب کتاب ارض القرآن جلد اول و جلد دوم میں بہت سے قرآنی علوم کو آشکارا کیا ہے۔ عصر حاضر کے ایک اور بڑے مفسر قرآن علامہ طنطاوی جوہری مصری نے مختلف قرآنی آیتوں سے جو عصری علوم و فنون پیدا ہوتے ہیں اُن کی صراحت انکی بے نظیر تفسیر طنطاوی میں کی ہے۔ اس تفسیر کے کچھ حصوں کا اردو ترجمہ جامعہ عمرآباد ارکاٹ، مدراس سے شایع ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے علم تاریخ، معاشیات، سماجیات (سوشیالوجی) سیاسیات، دستور مملکت، انتظام مملکت (پبلک اڈمنسٹریشن) نیز آثار قدیمہ، ٹاؤن پلاننگ، علم فلکیات، ارضیات، معدنیات خصوصاً حجریات، نباتیات، حیوانیات خاص کر علم طیور وغیرہ پر بحث کی جائے، قرآن مجید نے خود بتایا ہے کہ فضا میں (فی الجو) جو پرندے اڑتے رہتے ہیں وہ بھی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار مصنوعات مثلاً لوہے

اور تانبے کو پگھلانے، جہاز سازی اور جدید ترین ترقی یافتہ علم موسمیات کا بھی تذکرہ ہونا چاہیے جو ہوائی جہازوں کی اڑان کے لیے کارآمد علم ہے طوفانی اور مانسونی ہواؤں کا پتہ دیتا ہے۔

علم الولادت کا بھی قرآنی آیتوں میں تذکرہ موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"بہرحال ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں: مثلاً علم نباتیات، علم حیوانیات، علم حجر، علم بحر، علم ہیئت یہاں تک کہ علم جنین کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ قرآن مجید میں علم جنین کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا اس جدید ترین دور تک بھی اثر ہو رہا ہے دو سال قبل پیرس میں ایک کتاب: بائبل، قرآن اینڈ سائنس چھپی ہے، جو ایک مشہور سرجن بوکائی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر بوکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دلچسپی ہے، وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں ان کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم اطبا کو تھا اور نہ زمانۂ حال کے یورپی لوگوں کو ہے، جنھوں نے سالہا سال تک اس موضوع پر ریسرچ کی ہے، لیکن اب سے چودہ سو سال قبل ایک بدوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا تذکرہ کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن مجید کی اس آیت سے متاثر ہو کر اب سے کوئی دو ماہ پہلے بوکائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔"

(خطبات بہاولپور نقرہ : ۳۶۱)

اگر ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کی کتاب کے جدید اڈیشن میں ان علوم کا بھی تذکرہ آجائے تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ تاہم قرآن مجید کے شیدائیوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کتاب خوشنما، دیدہ زیب چھپی ہے اور ڈمی سائز کے ۳۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت تیس روپیے سکہ ہند ناشر: حامی بک ڈپو۔ چار کمان، حیدرآباد (ہند)

مطبوعات جدیدہ

عظمت حدیث مرتبہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۴۴، قیمت ۷۰ روپے، ناشر: دارالعلم ۶۹۹ آب پارہ مارکیٹ، اسلام آباد، پاکستان۔

قرآن مجید کے بعد اسلامی قانون و شریعت کا دوسرا اہم اور بنیادی ماخذ حدیث نبویؐ ہے، اس کے بغیر خود قرآن مجید کے مفہوم و مطلب کی توضیح اور اس کی مجمل آیتوں کی تفصیل و تشریح اور ان کے معنی کی تعیین ممکن نہیں ہے، اسی لیے اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس کے مصنف مولانا عبدالغفار حسن صاحب کو احادیث سے خاص شغف ہے، اس میں انھوں نے دین میں حدیث کا درجہ و مرتبہ اور اس کی عظمت و اہمیت بیان کی ہے اور احادیث کی حجیت و استناد پر گفتگو کر کے منکرین حدیث کے شکوک و شبہات کا مدلل جواب دیا ہے، اس ضمن میں انکار حدیث کی مختصر تاریخ اور متحدہ ہندوستان کے بعض مشہور منکرین حدیث کے خیالات کا جائزہ بھی لیا ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مندرجہ ذیل عنوانات سے کیا جا سکتا ہے، سنت، خبر واحد کی حجیت وحدت امت، روایت بالمعنی، تدوین سنت، حافظین و جامعین حدیث، خلفائے راشدین ائمہ محدثین، فقہا اور مستشرقین، ایک جگہ حد رجم کے تعلق سے مولانا امین احسن اصلاحی کے تفرد پر بھی شائستہ و سنجیدہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے، فاضل مولف کے جد امجد مولانا عبدالجبار محدث عمرپوری نے عبداللہ چکڑالوی کے بعض اعتراضات کا جواب اپنے رسالہ

ضیاء السنۃ (۱۹۰۲ء) میں دیا تھا اور ان کے والد مرحوم مولانا عبد الستار حسن نے بھی ایک رسالہ "منکرین حدیث کے اعتراضات اور ان کا جواب" کے نام سے تحریر کیا تھا، یہ دونوں رسالے اور مولانا کے صاحبزادے مولوی صہیب حسن صدر جمعیۃ القرآن لندن کا ایک مقالہ "اسناد حدیث اور مستشرقین" بھی اس کتاب میں شامل ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب منفرد ہے کہ اس میں حمایت حدیث میں لکھی جانے والی ایک ہی خانوادہ کی چار پشتوں کی تحریریں یکجا کی گئی ہیں۔

غالب درون خانہ از جناب کالیداس گپتا رضا، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت سرورق بہترین، صفحات ۳۲۴، قیمت ۱۲۵ روپیے، ناشر: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۰ جولی بھون، ۱۰ نیو مرین لائینز بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔

مرزا غالب کے شیدائیوں اور سخن فہم طرفداروں میں جناب کالی داس گپتا رضا کا نام بہت ممتاز ہے، اس سے قبل غالب پر ان کی نو کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور اسی قدر طبع ہونے سے رہ گئی ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے غالب کی پیدائش کے سال، ان کے نام و مذہب، خاندان، اہلیہ، اعزہ و اقربا اور ملازم خاص وغیرہ عنوانات کے تحت انکی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور تمام واقعات سنین کی ترتیب سے دیے ہیں، اس سلسلہ میں گو انھوں نے قیاس اور اندازہ سے بھی کام لیا ہے اور خود ان کے خیال میں ان میں اختلاف کی گنجایش بھی ہے تاہم قرائن و شواہد سے انھوں نے اپنے خیال کو موثق قرار دیا ہے، غالب کی تاریخ ولادت ان کے سفر کلکتہ اور جد امجد (رب ۱۷۳۰ء) سے آخری دور تک کے ان کے خانوادہ کے افراد (سنہ ۱۹۵۴ء) کی جو توقیت کی گئی ہے اس سے فاضل مولف کی محنت، دیدہ ریزی اور تلاش و تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ

اور ان کے چچا مرزا افضل بیگ کے متعلق پُر از معلومات تحریروں کے علاوہ آبحیات میں غالب کے بارے میں شامل مواد کو ضروری حواشی سے مزین کر کے نقل کیا گیا ہے آخر میں مفصل اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

کتبخانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات از جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت، سرورق بہترین، صفحات ۲۹۲، قیمت ۱۰۰ روپیے

پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تقریباً سو برس پہلے کتب خانہ کی طرح بمبئی کی جامع مسجد سے متعلق ایک مدرسہ بھی تھا جو اب امتداد زمانہ سے باقی نہیں رہا۔ عرصہ تک کتبخانہ بھی غیر مرتب اور برے حال میں رہا مگر اسکی ہزاروں اردو فارسی اور عربی کتابیں تشنگان علم و ادب کو سیراب کرتی رہیں، مطبوعات کے علاوہ اس میں مخطوطات کا بھی اچھا ذخیرہ تھا، ۳۵ برس پہلے بمبئی کے سہ ماہی مجلہ نوائے ادب میں اسکے بعض اہم اردو نسخوں کا تعارف شایع ہوا تھا مگر یہ نامکمل تھا اب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے ۱۸۸ اردو مخطوطات کی یہ فہرست سلیقہ سے مرتب کر کے شایع کی ہے اس میں انکے موضوعات و مشمولات اور مصنفین کے حالات دیے گئے ہیں اور انکی قدامت و اہمیت کو بھی [illegible] سے واضح کیا گیا ہے جو مخطوطات اب طبع ہو چکے ہیں یا جنکے نسخے دوسرے کتبخانوں میں دستیاب ہیں انکی بھی صراحت کر دی گئی ہے، بعض مخطوطات تو بہت اہم ہیں ان میں دو یعنی سند رسنگار اور سیہ پوش کی نشاندہی مرتب نے بھی کی ہے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک احیائے دین کی حمایت و مخالفت میں بھی بعض مخطوطے ضروری اور اہم معلومات کے حامل ہیں اس کتاب کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے اس سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

پُر اسرار بندے از جناب عشرت جاوید، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۶، قیمت ۴۰ روپیے ناشر: مکتبہ عقاب المسلمین،

جی اسٹریٹ نگینہ (بجنور) یوپی۔

صحابہ کرامؓ اور بزرگان دین کے مقدس حالات و واقعات اور ان کی پاکیزہ اور مثالی زندگی ہر دور میں نمونہ عمل اور سبق آموز رہی ہے۔ ما... اور آلائشوں اور سیرت و اخلاق کی پستی کے اس دور میں ان پاکیزہ واقعات سے وا...ت اور زیادہ ضروری ہوگئی ہے، اسی نیک مقصد و جذبہ سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ لائق مصنف نے واقعات کے انتخاب میں بڑی حد تک مستند کتابوں سے مدد لی ہے اور مبالغہ آمیز، مافوق العادت اور بعید از عقل واقعات نقل کرنے سے احتراز کیا ہے اس طرح اس کتاب میں بعثت نبویؐ سے علامہ اقبال اور احمد بن بیلہ تک کے پُرکیف اور روح... پرور واقعات دس ابواب میں سلیقہ سے مرتب کیے گئے ہیں، ان واقعات کا تعلق صرف عشق نبوی سے ہے آئندہ جلدوں میں دوسری نوعیت کے واقعات مرتب کیے جائیں گے　ہر واقعہ کے آخر میں ماخذ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ ہر واقعہ کا عنوان اقبال یا بعض دوسرے شعرا کے کلام کو بنایا گیا ہے اسکی وجہ سے لطف و کیف دو بالا ہوگیا ہے، اقبال کے اشعار کو اس کثرت سے برمحل استعمال کیا گیا ہے کہ یہ کتاب کلام اقبال کی شرح و ترجمانی معلوم ہوتی ہے، معنوی پاکیزگی و لطافت کیطرح کتاب کا ظاہر بھی نہایت حسین اور جاذب نظر ہے۔

سیکولر ٹریڈیشن اینڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

از جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی

پتہ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

مسلم یونیورسٹی کی مذہبی رواداری، وسیع المشربی اور تعلیمی و تہذیبی فراخدلی کی روایتیں ہر دور میں شاندار اور پرشکوہ رہی ہیں۔ زیر نظر رسالہ میں اسکی ایک جھلک دکھائی گئی ہے اور سرسید کے نظریات، تعلیمی تحریک کا کردار، قومی یکجہتی، اساتذہ اور طلبہ میں مساوات اور مختلف شعبوں میں غیر مسلم افراد کی شمولیت اور انکے اعداد و شمار کا جائزہ لیکر یونیورسٹی کے بارے میں سرسید کے قول و فعل کی سچائی اور ہم آہنگی کو واضح کیا گیا ہے۔

(ع۔ص۔)

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

حصۂ اوّل (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے ...حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/-

دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابر ...ش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے۔ ۴۵/-

سوم (مہاجرین دوم) شاہ ...الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے ...و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں ...کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/-

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ ...ور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور ...ہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعہ ...کربلا درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان ...ام کا ذکر ہے، جو ...فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے ...یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/-

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات اور عام صحابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/-

حصۂ نہم (اسوۂ صحابہؓ اول) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات، ...اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دہم (اسوۂ صحابہؓ دوم) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور ...علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/-

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور ...علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ۱۵/-